غمِ آرزو

(ناول)

غم آرزو رئیس احمد جعفری

ناول

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ، کراچی (پاکستان)

قیمت [illegible] روپیہ

جملہ حقوق دائمی بحق
چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری
مالک
نفیس اکیڈیمی و مسعود پبلشنگ ہاؤس، بلاکس اسٹریٹ
کراچی محفوظ ہیں

طبع اول:—— جولائی ۱۹۵۹ء
مطبوعہ:—— انٹرنیشنل پریس کراچی
قیمت:—— چھ ۶ روپیہ

فہرست

وہ دن خوشی کے	۹
کارگاہِ ہستی	۴۹
زندگی	۱۱۳
وہ اک نگاہ	۱۶۷
خلش	۲۲۵
غمِ آرزو	۲۹۱
مایوسی	۳۴۷
سرور ونشاط	۳۷۹
سوزِ حیات	۳۹۱
انجام	۴۰۱

عجب خاں کے نام!

وہ میرا ملازم تھا، ذات کا پٹھان، مزاج کا کھرا، وفادار، کارگزار، خیراندیش —— پھر وہ ایک بڑے ہوٹل کا دربان بن گیا، لیکن مہینہ میں ایک مرتبہ کچھ پھل لے کر ملنے ضرور آتا، یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا،

کچھ عرصہ ہوا میں مرض قلب (کارونری تھرامبوسس) میں مبتلا ہوا، اس بیماری نے مجھے افلاس کے گڑھے میں دھکیل دیا، دوست، عزیز، آشنا سا، سب نے آنکھیں بدل لیں۔ ایک روز عجب خاں آیا، اس نے پانچسو روپے میرے سامنے رکھ دیئے اور کہا،

"یہ میری پونجی ہے، لے لیجئے، ۱۰۵ روپے مجھے تنخواہ ملتی ہے، ۴۰ مجھے کافی ہیں، ہر مہینہ کی پہلی کو ۶۵ روپے نذر کر دیا کروں گا، میں نے شکریہ کے ساتھ اس کی پیشکش مسترد کر دی، وہ خاموش ہو گیا، میں کئی مہینہ تک بستر علالت پر پڑا رہا، لیکن پھر وہ نہ آیا، جب

ذرا اچھا ہوا تو اس کی تلاش کی، لیکن وہ ہوٹل کی نوکری چھوڑ چکا تھا، شہر سے جا چکا تھا——————

شاید مجھ سے روٹھ کر!"

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں؟
مرے حوصلہ کی پستی، مرے شوق کی بلندی

وہ دِن خوشی کے ....

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے؟

دل کی خوشی مال و دولت سے وابستہ نہیں ہوتی، جن گھروں میں سیم و زر کی ریل پیل ہوتی ہے۔ وہاں غم کے سائے تڑپتے مچلتے نظر آتے ہیں، جہاں نان قبینہ کی فکر ہر دم مسلط رہتی ہے، وہاں سے خوشی کے نغمے بلند ہوتے ہیں، مسرت کے ترانے سنائی دیتے ہیں۔

جس گھر میں حبیبہ نے آنکھیں کھولیں، وہاں امارت کی چھاؤں بھی نہیں پڑی تھی، اس کے والد نعیم میاں ایک اخبار میں مترجم تھے۔ شام کے سات بجے دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ ٹیلی پرنٹر خبریں اگلتا رہتا اور وہ انہماک اور یکسوئی کے ساتھ ترجمہ کر کرکے سلپیں کاتب کی طرف بڑھاتے رہتے، رات کے دو بجے تک یہی سلسلہ جاری رہتا، پھر اخبار کی آخری کاپی اپنے سامنے جڑواتے۔ تین بجے کے قریب فراغت ہوتی، چار بجے کے قریب گھر پہنچتے، اور بستر پر دراز ہو جاتے۔ سوتے سوتے پانچ بج جاتے، گیارہ بجے دوپہر کو جاگتے

بگڑ جاتے۔ پروپرائٹر صاحب ذرا نخرے دکھاتے تو اسٹرائک پر آمادہ ہو جاتے، اوور ٹائم کے ہمیشہ منتظر رہتے، اور بڑی سختی سے اس کا مطالبہ کرتے اور اسے وصول کرتے۔ با تنخواہ چھٹیوں کے جویا رہتے، ہر سال تنخواہ میں حسب دلخواہ اضافہ کے متوقع رہتے، اور جب یہ آرزو پوری نہ ہوتی تو کام بگاڑ دیتے، خراب کر دیتے، آخری کاپی پریس میں دیر سے بھیجتے۔ تاکہ اخبار لیٹ شائع ہو اور اہم خبریں، جو دیر سے آتیں وہ درج اخبار نہ کرتے، تاکہ اس کی ساکھ پر اثر پڑے، اور دوپہر کو جب ہاکر اور ایجنٹ اخبار کی بڑی بڑی گٹھڑیاں مالک کی میز پر لا کر پٹکتے اتو مالک صاحب تمام مترجمیں، سب ایڈیٹرس اور کاتبوں کو اپنے دربار شہریاری میں طلب فرماتے، اچڑھی ہوئی تیوریوں کے ساتھ دریافت فرماتے اکسی مترجم کی طرف دیکھ کر،

"دیکھ رہے ہیں آپ یہ میرے سامنے کیا پلندہ پڑا ہے۔!"

مترجم دوسرے مترجم کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا اور زیر لب مسکراتے ہوئے کہتا :-

"ہمارا اخبار ہے"!

مالک صاحب جل ہی تو جاتے

"ہمارا اخبار ہے ——————— (غصہ میں) آپ کا اخبار ہوتا، آپ اسے اپنا اخبار سمجھتے تو یہ ہوتا؟ اس طرح یہ پلندے کے پلندے واپس آتے، (ہاکر سے مخاطب ہو کر) کیوں سلطان یہ ردی کا

جاتے، حوائج ضروری سے فراغت کرتے، غسل اور تبدیلی لباس کرتے کرتے بارہ بج جاتے یہ وقت ان کے ناشتہ کا تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر، کچھ دیر بیوی سے ہنستے بولتے اور پھر شام کے پانچ بجے تک یا کتابیں پڑھتے یا اپنی اکلوتی لڑکی صبیحہ سے باتیں کیا کرتے، اسے پڑھاتے، کہانیاں سناتے، تاریخ کا سبق دیتے، لطیفے بیان کرتے کشیدہ کاری سے بالکل ناواقف ہونے کے باوجود اس سلسلہ میں ضروری مشورے دیتے۔ غرض یہ سارا وقت صرف صبیحہ کے ساتھ بسر کرتے، پھر پانچ بجے شام کو دوپہر کا کھانا کھاتے، سگریٹ پی رہے ہوتے کہ بیوی رقیہ خانم پان لگا کر دے دیتیں، وہ مسکرا کر ان کے ہاتھ سے پان لیتے، اور نہایت اطمینان سے اپنے دفتر تشریف لے جاتے۔ جیسے غازی رن پر جا رہا ہو!

دفتر میں بارہ بجے رات تک سر جھکائے کام کرتے تھے، پھر قریب کے ایک معمولی سے ہوٹل میں جاتے، وہاں چائے کا "آرڈر" دیتے، ذرا دیر میں میلا کچیلا ملازم چائے کی ایک پیالی اور سلائس کے دو ٹکڑے رکھ جاتا، چلئے یہ رات کا کھانا ہو گیا، جسے وہ "ڈنر" سے تعبیر کیا کرتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بخار نے آ دبوچا، یا سر ہے کہ درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے، لیکن دفتر کی حاضری کیا مجال جو ناغہ ہو، وہی شگفتہ روئی، وہی آسودگیٔ خاطر، وہی آنکھوں میں سکون و نشاط کی جھلک، وہی انداز و اطوار میں قناعت اور بے فکری کا رنگ!۔

کاتب ہوں یا مترجم، رپورٹر ہوں یا سب ایڈیٹر، یہ اکثر غوطہ لگا جاتے، دیر سے آتے، دفتر میں بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتے چائے دیر میں ملتی تو

"آخر کاپی چھاپنے کے لئے کم از کم دو گھنٹے چاہئیں، سو چار بجے صبح کے بجائے سات بجے آخری کاپی ملی، ٹھیک نو بجے چھپ گئی، پولیس کے ملازم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے، ان کا اوور ٹائم الگ چڑھا، جو آپ کے بل میں شامل کر دیا جائے گا، کیونکہ ہماری تو کوئی خطا ہی نہیں جناب!"

مالک صاحب نے یہ ساری گفتگو دوہرا کر اسی مترجم سے دریافت فرمایا:-

"آخر کاپی لیٹ کیوں گئی؟"

مترجم نے پھر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور اس کا اشارۂ چشم پا کر کہا، "یہ نعیم صاحب سے پوچھئے، بیٹھے بیٹھے اونگھ گئے، سات بجے آنکھ کھلی تب جلدی جلدی کاپی جوڑ کر بھیجی! ہمارا خود وقت ضائع ہوا۔

اس کذب صریح کا مالک کو یقین نہیں آیا۔

"غلط ——— نعیم غیر ذمہ دار آدمی نہیں ہے!"

ہاکر بیچ میں بول پڑا،

"آج کی سب سے اہم خبر زلزلہ کی ہر اخبار میں موجود ہے مگر نہیں ہے تو ہمارے اخبار میں، صاحب کس طرح کام چل سکتا، بھلا آپ ہی غور کیجئے

مالک نے سوالیہ نظروں سے پھر مترجم کی طرف دیکھا، اس نے کہا۔

"میں کیا بتاؤں؛ اس کا جواب بھی نعیم صاحب دیں گے۔

مالک نے چپراسی کو بلایا اور حکم دیا فوراً نعیم صاحب کو لے آؤ، وہ گھر میں اپنی بیٹی صبیحہ کو تاریخ یورپ کے چند واقعات بتا رہے تھے، اتنے

ڈھیر کیوں لاتے ہو تم؟

ہاکر صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے کہتا۔

"صاحب اس طرح تو ہم مزوری (مزدوری) کر چکے۔ یہی اخبار بیچتے ہیں اور ڈھائی تین روپے، دھوپ میں بارش میں، گرمی میں، سردی میں، دوڑ دوڑ کر، چیخ چیخ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر کما لیتے ہیں، قسم لے لیجئے جو آج پچاس اخبار بھی بیچے ہوں اب تک دو بجنے کو آئے۔!

مالک صاحب کا پارہ اور چڑھ جاتا

"آخر کیوں؟ —————— کیا خرابی ہے اس اخبار میں جس اخبار کی دو سو کا پیاں روز بیچ لیتے ہو آج اس کی پچاس کاپیاں بھی نہ بیچ سکے؟

ہاکر جواب دیتا،

اخبار صبح فجر کے وقت ملنا چاہیئے، آج آٹھ بجے کے بعد ملا، لوگ ہمارا انتظار کیوں کرتے، انھوں نے دوسرا اخبار لے لیا، ہم دیر میں اخبار لے کر پہنچنے پر گالیاں الگ سنتا پڑیں، بھلا اس طرح کہیں اخبار چل سکتا ہے؟ میں تو صاحب کوئی دوسرا اخبار پکڑوں گا!"

مالک صاحب نے ٹیلیفون کا چونگا اٹھایا، پریس کے مینجر سے پوچھا

"جناب ہم آپ کا پے منٹ وقت پر کرتے ہیں، آپ ہمارا اخبار لیٹ چھاپتے ہیں، اس طرح کیسے کام چلے گا؟

وہاں سے جواب ملا۔

"کیوں ؟"

"فرصت ہی نہیں ملتی، صبح چار بجے تو یہاں سے جاتا ہوں"

نقطۂ گرفت مالک کے ہاتھ میں آ گیا،

"صبح چار بجے تک، بلکہ سات بجے تک اگر بیٹھے بیٹھے سوتے رہیں تو کیا فائدہ ؟"

بے زبان، خاموش اور سنجیدہ نعیم نے تیکھے لہجہ میں سوال کیا،

"میں سات بجے تک سوتا ہوں، یہ آپ سے کس نے کہا ؟"

مالک صاحب نے بپھرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا،

آپ کے ساتھیوں نے آپ کے عمل نے، غضب خدا کا، اخبار کی کاپی سات بجے پریس میں پہنچی، اور پھر بھی زلزلہ کی خبر ندارد۔"

نعیم چونک پڑا،

کاپی سات بجے پریس گئی ؟ ——— زلزلہ کی خبر نہیں آئی ؟"

مالک نے اخبار نعیم کی طرف پھینکتے ہوئے کہا

"خود ہی دیکھ لیجئے، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے ؟"

نعیم نے ایک نظر اخبار پر ڈالی اور کہا،

"ممکن ہے آپ حسبِ ضرورت جھوٹ بول سکتے ہیں، لیکن شدید ضرورت کی حالت میں بھی میرے منہ سے جھوٹ نہیں نکل سکتا ———

کاپی اپنے وقت پر پریس گئی، زلزلہ کی خبر میں نے خود ایسوسی ایٹڈ پریس کے آخری خبرنامہ موثق کی پھر اخبار لیٹ کیوں چھپا، اور خبر کیوں نہیں آئی،

بس حکم حاکم ملا، فوراً ہانپتے کانپتے پہنچے، مالک ان کی خاموشی اور سنجیدہ طبیعت اور سب سے بڑھ کر قناعت اور بے زبانی سے بہت متاثر تھا، اس لئے کہ سارے اسٹاف میں بھی ایک ایسا شخص تھا، جس نے کبھی اوور ٹائم کا مطالبہ کیا، نہ اضافہ تنخواہ کا، نہ رخصت کا، نہ تعطیل کا، جس نے کبھی غیر حاضری نہیں کی جو کبھی کسی شورش میں شریک نہیں ہوا، جو پہلے دن سے آج کئی سال گزر جانے کے بعد بھی سوا سو روپے ماہوار لے رہا ہے، حالانکہ اس کے بعد آنے والے لوگ ہر سال لڑ جھگڑ کر، کچھ نہ کچھ اضافہ کرا ہی لیتے ہیں اگر کوئی معمولی غلطی ہوتی تو مالک صاحب حاکمانہ دریا دلی سے کام لے کر اس خطا کار کو بخش دیتے لیکن یہ اتنی بڑی غلطی تھی، جسے معاف کرنے کے معنی تھے، اپنے محضر قتل پر دستخط کرنے کے اپنے اخبار، یعنی ذریعہ رزق کو اپنے ہاتھوں برباد کر دینے کے، انہوں نے نعیم کو تند نظروں سے دیکھا اور کہا۔

آج کا اخبار دیکھا آپ نے؛

نعیم نے نہایت سادگی کے ساتھ کہا۔

"جی نہیں"!

مالک کا جلال کچھ اور بڑھ گیا،

"آپ نے آج اپنا اخبار نہیں دیکھا۔

نعیم نے جواب دیا۔

"کسی دن بھی نہیں دیکھتا!"

اب تو غصہ حد برداشت سے باہر ہو گیا۔

نعیم نے کہا،

"تمہارا دو سو میں بھی گزر نہیں ہوتا، میں سوا سو میں گذارہ کر لیتا ہوں، اضافہ کا مطالبہ تمہارے لئے جائز ہے، میرے لئے ناجائز!

رفیق ہنسنے لگا۔

"کیا کہنا ہے اس مرد پارسا، اور درویش باصفا کا، لیکن یار اب تو سوا سو میں بھی کمی ہو جائے گی، آج کا نقصان تمہاری تنخواہ سے وضع ہو گا۔ اب کیا کرو گے؟

نعیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب فاقہ کر کے گزارہ کر لوں گا،!   لیکن وہ خبر کس طرح غائب ہو گئی؟ اور کاپی دیر میں کیوں پہنچی؟

رفیق نے ایک قہقہہ لگایا۔

"یہ تو یار لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے، یہ کون سا مشکل کام ہے دلاور (چپڑاسی) کو دو روپے تھما دیئے، اور زلزلہ کی خبر پھاڑ کر دوسری خبر لگا دی، صرف پانچ منٹ صرف ہوئے اس کارِ خیر میں!"

یہ کہہ کر رفیق نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

اب بھی اگر توبہ کر لو اور ہر معاملہ میں یاروں کا ساتھ دینے کا مطالبہ کرو، تو تمہاری تنخواہ بھی بڑھ سکتی ہے، اور جرمانہ بھی معاف ہو سکتا ہے۔

نعیم غور سے رفیق کی باتیں سنتا رہا، اس اثناء میں وہ ایک کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ گھسیٹتا رہا تھا، پھر اس نے وہ سلپ دلاور کی طرف

یقیناً یہ کسی کی شرارت ہے!"

نعیم کے الفاظ کافی اشتعال انگیز ثابت ہوئے، مالک کا چہرہ وفور غضب سے سرخ ہو رہا تھا، اس نے نعیم کے منہ کے بجائے میز کی پیٹھ پر ایک زور دار گھونسہ لگایا، اور گرجتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا یہ کس کی شرارت ہے، بہرحال کسی کی بھی ہو، ذمہ داری آپ ہی کی ہے، لہٰذا آج کا نقصان آپ کی تنخواہ سے وضع کیا جائے گا (کیشیر سے مخاطب ہوکر) نوٹ کرو!"

کیشیر نے یہ حکم عالی نوٹ کر لیا، نعیم اپنے کمرہ میں واپس آگیا، ایک ساتھی نے کہا۔

"نعیم صاحب، ہمیں ہمدردی ہے آپ سے!"

نعیم نے بے فکری کے ساتھ جواب دیا۔

"شکریہ!"

وہ ساتھی کہنے لگا۔

اب سنیے اصل ماجرا کیا ہے،

نعیم سننے لگا، ساتھی نے بتایا۔

"یہ رفیق (دوسرا مترجم) تم سے خار کھاتے ہوتے ہے، اور اب ہم لوگ بھی تم سے خفا ہیں، جب بھی ہم کوئی مطالبہ پیش کرتے ہیں، تم الگ رہتے ہو، اور اس سے تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا، تمہاری تنخواہ سوا سو سے ایک پیسہ نہیں بڑھی، یار لوگ، دو سو پا رہے ہیں!"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟ ——— کیا مطالبہ ہے تمہارا؟"
رفیق نے کہا۔

"کم سے کم سو تو ملیں"!

با دل نخواستہ پروپرائٹر صاحب کو یہ مطالبہ ماننا پڑا۔

"جائیے تشریف لے جائیے، سو روپیہ سہی"!

رفیق مسکراتا ہوا آیا، اور اپنی میز پر بیٹھ کر کام کرنے لگا۔

بڑھا دی، اور کہا۔

"جاؤ، یہ صاحب کو دے آؤ جا کر۔"

"ابھی!"

اس کے بعد وہ رفیق کی طرف مخاطب ہوا۔

"شکریہ!——————— السلام علیکم ———!"

اور خاموشی کے ساتھ نکلا چلا گیا، یہ لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، اتنے میں دلاور آیا، اس نے رفیق سے کہا۔

"صاحب بلاتے ہیں!"

رفیق وہاں پہنچا تو یہ خوشخبری سننے میں آئی کہ نعیم نے استعفا دے دیا، جب تک کوئی نیا بندوبست نہیں ہو جاتا، رفیق کو نعیم صاحب کا کام بھی کرنا ہوگا۔

نعیم صاحب، اس عزت افزائی پر دل میں تو خوش ہوا، لیکن زیادتی کار پر احتجاج کرنے ہی والا تھا کہ پروپرائٹر صاحب نے متبسم ہو کر ارشاد فرمایا۔

"پچاس روپے ماہوار الاؤنس ملے گا تمہیں!"

رفیق اڑ گیا،

"نہیں صاحب یہ کم ہے، اسے سوا سو تنخواہ ملتی تھی اور وہ بجائے خود کم تھی، پچاس روپے الاؤنس پر میں کام نہیں کر سکتا۔!"

پروپرائٹر صاحب بہت جھلائے، بس چلتا تو منہ نوچ لیتے اس بدبخت کا، لیکن اخبار بہرحال وقت پر نکلنا تھا، جز بز ہو کر پوچھا۔

نہیں ہوتے، دولت کونین کسی نے اُن کے قدموں پر نچھاور کر دی ہے، بے فکری کی شان سے گویا ہوتے۔

"بہت تھک گیا تھا، کام کرتے کرتے حکیم، ڈاکٹر، وید، ہومیو پیتھ، دوست، دشمن، سب کی رائے یہی تھی کہ مجھے آرام کرنا چاہیئے، اور جناب رقیہ بیگم صاحبہ آپ بھی تو بڑی دلسوزی کے لہجہ میں اس خاکسار کے حالِ زار پر ماتم کیا کرتی تھیں، اب میں نے آرام کرنے کا انتظام کیا تو ماتھے پر شکن پڑ گئی، واقعی عورت کا سمجھنا آسان نہیں ،!"

رقیہ معمولاً نعیم کی ایسی باتوں پر ہنس دیا کرتی تھی، لیکن آج مستقبل کا سوال دامنگیر تھا، اس کے افسردہ ہونٹوں پر تبسم کا کہیں نام ونشان نہ تھا، اس نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب گھر کا کام کیسے چلے گا؟ بس ایک تنخواہ ہی تو تھی، جس سے سارے کام نکلا کرتے تھے۔"

نعیم نے جواب دیا۔

"کیوں پریشان ہوتی ہو؟ سارے کام جس طرح چلتے تھے، اسی طرح چلتے رہیں گے؟ ایک دوسرے اخبار میں بہت دنوں سے مجھے بلایا جا رہا تھا اب چلا جاؤں گا!"

اس جواب سے صبیحہ تو کسی حد تک مطمئن ہو گئی، لیکن رقیہ بیگم اس کے کھوکھلے پن کو محسوس کرتی تھیں، کہنے لگیں،

"جیسے وہ رکھ ہی تو لے گا۔"!

(۲)

استعفیٰ دے کر نعیم گھر پہنچا، وہ خلافِ معمول وقت سے پہلے گیا تھا، اور وقت سے پہلے آگیا، یہ نئی بات تھی، رقیہ اور صبیحہ کو حیرت ہوئی، دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"ارے ——————"

نعیم نے ایک قہقہہ لگایا،

"بھئی میں استعفیٰ دے کر آ رہا ہوں!"

رقیہ کا منہ سوکھ گیا،

"استعفیٰ دے کر؟ —————— — یہ کیوں؟"

صبیحہ نے سوال کیا،

"پھر اب کیا ہوگا"

نعیم صاحب اس وقت اتنے خوش نظر آ رہے تھے، جیسے وہ بےروزگار

نعیم کو بےساختہ ہنسی آ گئی،

رقیہ "تمہیں ابھی اور فوراً مسکرانا پڑے گا، ورنہ واقعی نہ میں کوئی دوسری نوکری تلاش کر پاؤں گا، نہ ملے گی، مجھ میں حوصلہ صرف تمہارے تبسم سے پیدا ہوتا ہے، وہی چھینے لے رہی ہو؛ ———— مسکراؤ جلدی سے، !"

رقیہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"ہٹو بھی!

نعیم صاحب خوشی کا جھولا جھولتے باہر چلے گئے۔

---

(۳)

روزنامہ نیرنگ کے پروپرائٹر سے نعیم کی پرانی ملاقات تھی، یہ شام کا اخبار تھا، اشاعت کم تھی، صرف اشتہارات کے بل پر چلتا تھا، شام کے اخبار کیلئے زیادہ عملہ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، بس ایک ایڈیٹر، ایک مترجم ایک سائکلسٹ اور متفرقہ کی انجام دہی کے لئے، خود پروپرائٹر مسٹر یوسف اور ایک چپڑاسی، نعیم سیدھا وہیں پہنچا، یوسف نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"کہو بھئی نعیم کہاں بھول پڑے راستہ آج؟

نعیم نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"بس اسی طرف"

یوسف نے پوچھا،

"کیسی گذر رہی ہے؟"

نعیم نے جواب دیا۔

یوسف :- جب یہ بیکار ہوتے ہیں تو گریجویٹ بیکینں بنے ملازمت تلاش کرتے آجاتے ہیں، ہر شرط منظور، ہر تنخواہ پر راضی، دو گھنٹے کے بجائے تین گھنٹہ کام کرنے پر مستعد، لیکن چپکے چپکے کسی فرم میں، یا سرکاری دفتر میں ملازمت تلاش کرتے رہیں گے، جہاں پر واقعہ ملازمت ملا، فوراً استعفیٰ دیا اور غائب، البا طوطا چشم میں نے کسی کو نہیں دیکھا، جیسے یہ گریجویٹ ہوتے ہیں، میں نے کہا بھائی شوق سے استعفیٰ دو ہم دعا کرتے ہیں ترقی کرتے کرتے، ایک دن تم ہمارے شہر کے ڈپٹی کمشنر بن جاؤ، لیکن اتنی بے مروتی تو نہ کرو کہ یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جاؤ، کم از کم ایک مہینہ کی مہلت تو دو، فرمانے گے واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؛ کیا میں اپنا مستقبل برباد کروں ؛ مجھے کل ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے، وہ تو ڈیوٹی پر حاضری دینے تشریف لے گئے، اور میں یہاں بیٹھا سر پیٹ رہا تھا کہ تم آگئے۔

نعیم :- کیوں جھوٹ بولتے ہو ؛ سر پیٹ رہے ہوتے تو یہ چار بال جو سر مبارک پر نظر آ رہے ہیں، یہ بھی داغِ جدائی دے چکے ہوتے،

یوسف :- اچھا بھائی میں جھوٹا سہی، کام کی باتیں کرو۔ آتے ہو نیرنگ میں ؛

نعیم :- آجاؤں گا،

یوسف :- کب سے ؛

نعیم :- جب سے کہو۔

یوسف :- میری رائے پوچھو تو آج ہی سے آجاؤ،

"یار بیر ٹیڑھے سوال نہ کیا کرو ؟"

یوسف نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا -

"سبحان اللہ کیا بات کی ہے ؟"

نعیم نے پہلو بدلتے ہوئے کہا -

"میں نے اتنی شاندار بات کی ہے کہ جناب داد دینے لگے"

یوسف نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا -

"یار ہمارے ہاں آجاؤ"!

نعیم نے پوچھا

"آ تو گیا تمہارے ہاں اور کس طرح آؤں ؟"

یوسف :- نہیں باقاعدہ ——————— مستقل طور پر!"

نعیم :- کیا کروں یہاں آکر ؟

یوسف :- نیرنگ کی ادارت ،

نعیم :- اور موجودہ ایڈیٹر صاحب کیا کریں گے ؟

یوسف :- وہ تو گئے

نعیم :- کہاں ؟

یوسف :- کسی دفتر میں ملازمت مل گئی اگر یہ بجویٹ لوگوں کو ملازم رکھنے .ہیں اسی لئے ، مجھے تامل ہوتا ہے ، بلکہ اب تو میں نے طے کر لیا ہے اکسی بھی گریجویٹ کو قطعاً ملازم نہیں رکھنے کا ،

نعیم :- کیوں آخر ؟

نعیم :- آج ہی سے آجاؤں گا۔

یوسف :- یار ہر وقت مذاق اچھا نہیں لگتا، کبھی تو سنجیدہ بن جایا کرو!
——— تو تم پینٹنگ میں کام کرنے پر تیار ہو؟

نعیم :- بھائی میں تو مزدور آدمی ہوں، نیر نگ ہو، بیرنگ ہو، نورنگ ہو۔ رنگا رنگ ہو، ہر جگہ کام کروں گا بشرطیکہ مزدوری ملے،

یوسف :- وہ تو ضرور ملے گی ——— کیا لوگے؟

نعیم :- وہ رقم بتا دو، جو آسانی سے بغیر بغلیں جھانکے، ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو دے سکو، ورنہ پھر میں کام بھی چھوڑ دوں گا، اور لڑائی بھی ہو جائے گی۔

یوسف :- تو بھئی سچی بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہم دو سو سے زائد نہیں دے سکتے، کام ترقی کرے، حالات سازگار ہو جائیں، آمدنی بڑھے تو چار سو کر لو، اگر میں انکار کروں تو جو چور کی سزا وہ میری،

نعیم :- پھر سوچ لو، یہ رقم آسانی سے ہر مہینہ تم دے سکو گے؟

یوسف :- ہاں بڑی آسانی سے،

نعیم :- ثبوت دو،

یوسف :- ثبوت کیسا؟

نعیم :- پچاس روپے اس وقت بطور پیشگی دو، ڈیڑھ سو پہلی تاریخ کو دے دینا، جب مہینہ ختم ہو،

یوسف :- (ہنستے ہوئے جیب سے نوٹ نکال کر) یار بڑے شریر ہو، یہ

کیوں نہیں کہتے، اس وقت روپے کی ضرورت تھی، خواہ مخواہ ملازمت کا ڈھونگ کیوں رچایا؟ روپے میرے پاس ہوں تو کیا انکار کر سکتا ہوں؟ پچاس نہیں سو لے لو۔

نعیم :۔ نہیں صرف پچاس،!

یوسف :۔ اچھا اب یہ بتاؤ، تم نے سوچا کیا ہے؟

نعیم :۔ سوچنا کیا ہے، ملازمت کر لی، تمہارے یہاں،

یوسف :۔ پھر وہی مذاق،

نعیم :۔ مذاق ہی مذاق میں تم مجھے ٹال دو، یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ میں تو واقعی اس نیت سے آیا تھا،!

یوسف :۔ (خوش ہو کر) تو آج ہی سے کام کرو گے؟

نعیم :۔ ہاں بھئی، اور کیا سال بھر بعد سے،

یوسف نے نعیم کو لے جا کر ایڈیٹر کے کمرہ میں بٹھا دیا، ملکی اور غیر ملکی، انگریزی اخبارات سامنے رکھ دیئے، مقامی، اردو اخبارات کا سیٹ بھی سامنے لا کر رکھ دیا۔ نعیم نے ضروری چیزوں پر سرخ پنسل سے نشانات لگا دیئے، اور مترجم کے حوالے کئے، کچھ خود اپنے لئے رکھ لئے جلدی جلدی ان کا ترجمہ کیا، پھر لیڈنگ آرٹیکل لکھا چند ادارتی نوٹ سپرد قلم کئے، مزاحیہ کالم خود یوسف لکھا کرتا تھا، وہ اس نے لکھ دیا، مراسلات کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا، ان میں سے ضروری مراسلات چھانٹے، کاتب لکھے جاتے تھے اور نعیم ان کی رفتار کتابت کا کنٹرول کر رہا تھا کہ وقت پر سارا کام ختم

تنوع ہے۔ دلچسپی ہے، مختلف، اور متعدد دلچسپ عنانات ہیں، تم تو چھپے رستم نکلے، مجھے یقین ہے کہ اب ہمارا اخبار ترقی کرے گا، اور اپنے معاصرین سے بازی لے جائے گا،

نعیم خاموشی سے یوسف کی باتیں سنتا رہا، اور مسکراتا رہا، پھر اس نے ٹوپی سر پر رکھی اور کہا،

"اجازت چاہتا ہوں،!"

یوسف اُسے دروازہ تک چھوڑنے آیا، اور جب نعیم رخصت ہونے لگا۔ تو کہا۔

"یہ اخبار میرا نہیں تمہارا ہے،!"

ہو جاتے، جس جس چیز کی کتابت ہو جاتی تھی، اس کی تصحیح بھی ساتھ ساتھ کرتا جاتا تھا۔ یوسف نے جو انگریزی پرچے دیئے تھے۔ ان میں ٹائم، لائف، اور ریڈر   بھی تھے ان میں سے ایک دلچسپ مضمون کا بھی اس نے تیزی سے ترجمہ کر ڈالا، معلومات کے عنوان کے لئے ایک نئے کالم کا اضافہ کیا۔ اور وقت پر اخبار مکمل کر کے پریس بھجوا دیا، اور پھر یوسف کے کمرہ میں آکر بیٹھ گیا، یوسف کو شبہ تھا کہ آج پرچہ وقت پر نکل سکے گا یا نہیں؟ کیونکہ نعیم گو کارگذار اور محنتی آدمی تھا، لیکن بہرحال آج ہی وقت کے وقت، اس نے چارج لیا تھا، اور شام کا اخبار، اگر ذرا بھی لیٹ ہو تو دوسرے اخبارات بازی لے جاتے ہیں، اور پھر ایک پرچہ بھی نہیں بکتا، یوسف نے جب یہ دیکھا کہ نعیم اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے، اور اسے بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہو گیا ہے تو وہ گھبرایا کہ بس آج پرچہ گیا، اس نے کہا۔

"یار پہلے پرچہ پریس بھجوا لو، پھر اطمینان سے جتنی دیر چاہو بیٹھو"!

اتنے میں سائیکلسٹ تازہ اخبار کے بلندے سائیکل کی پیٹھ پر لادے ہوئے نمودار ہوا اور تازہ پرچہ یوسف کے سامنے رکھ دیا، اس نے لپک کر پرچہ اٹھایا اور اس پر ایک ایک نگاہ ڈالی اور خوشی کے عالم میں نعیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پرچہ تو چھپ بھی گیا! ——— کمال کر دیا بھئی، سچ کہتا ہوں آج اخبار ویسا نکلا ہے، جیسا میں چاہتا تھا، اس میں اخباریت ہے

تھی، اسی مختصر سی تنخواہ پر گھر کے جملہ مصارف کا دارومدار تھا، اس کے علاوہ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس بیکاری سے نعیم کا دل و دماغ کافی متاثر ہے، وہ ڈر رہی تھی، کہیں خدا نخواستہ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو؛ کہیں نعیم روپوش نہ ہو گیا ہو، بے خیالی میں کسی موٹر کے نیچے کچلا نہ گیا ہو، خودکشی نہ کر لی ہو، آج اُسے دفتر نہیں جانا تھا ملازمت پر حاضری نہیں دینی تھی، وہ نوکری کی تلاش میں گیا تھا، لیکن دوپہر کا گیا، اب رات کے نو بجے تک غائب، یہ کیا ماجرا ہے؟ بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے، اور صبیحہ اُسے تسلی دیتی،

"اماں گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ابا جی نوکری کی تلاش میں گئے ہیں، ممکن ہے مل گئی ہو، اور وہ کام کرنے لگے ہوں!"

رقیہ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیتی،

"تجھے بے وقوف نہ بناؤ صبیحہ نوکریاں اس طرح تو پڑی نہیں ہیں کہ بازار گئے، اور خرید لائے ———— لیکن وہ کہیں بھی گئے تھے، اب تک آئے کیوں نہیں؛ گھڑی کو دیکھتی ہو نو بج گئے رات کے!"

صبیحہ خود بھی کچھ کم پریشان نہیں تھی، لیکن وہ اپنی پریشانی کا اظہار کر کے رقیہ کو اور زیادہ سراسیمہ نہیں کرنا چاہتی تھی، کہتی ــ

"نو بج گئے، تو کیا ہوا بس اب آتے ہی ہوں گے ———— میرے خیال میں کسی دوست کے ہاں اٹک گئے!"

رقیہ چڑ گئی ـ

(۴)

نعیم نیرنگ کے دفتر سے نکل کر سیدھا بازار پہنچا، بائیس روپیہ کی ایک سوتی لیکن خوبصورت ساری رقیہ کے لئے خریدی، صبیحہ، بہت دنوں سے نائلون کے دوپٹہ کے لئے کہہ رہی تھی، بیس روپیہ کا ایک دلکش، اور نظر فروز دوپٹہ اس کے لئے خریدا، بہت دنوں سے سینما نہیں دیکھا تھا، رٹز کے قریب سے گزرا تو "پہیلی" فلم کا بورڈ نظر آیا، سوچا آج ذرا سی مفتو لطف خرچی کر لینے میں کچھ حرج نہیں، بالکنی کا ایک ٹکٹ خریدا، اور اندر داخل ہو گیا، فلم خاصی دلچسپ تھی، اس سے کافی محظوظ ہوا، نو بجے رات کو سینما ہال سے باہر نکلا طبیعت پیادہ روی پر آمادہ تھی، ٹہلتا ہوا کوئی دس بجے کے قریب گھر پہنچا۔

رقیہ اور کسی حد تک صبیحہ بھی نعیم کے اب تک نہ آنے سے پریشان تھیں، رقیہ نعیم کی مزاج شناس تھی، وہ جانتی تھی، نوکری چھوٹنے کا نعیم کو غم ہے، اس کے قہقہوں کا کھوکھلا پن ویسے محسوس کر لیا تھا، وہ یہ بھی جانتی

اس نے اپنی قیمت وصول کر لی،

"بیٹی بڑی دیر سے پان نہیں کھایا ہے، ذرا ایک ٹکڑا بنا دے اپنے ہاتھ سے، تیرے ہاتھ کے پان میں مزا آجاتا ہے۔"

صبیحہ نے اس داد و تحسین کی طرف ذرا توجہ نہ کی، پان بنایا، اور بڑھیا کی طرف بڑھا دیا، اس نے پان منہ میں رکھا اور اپنا مرغوب مشغلہ یعنی کھانسنا شروع کر دیا، وہ بھی اس تسلسل کے ساتھ کہ معلوم ہوتا تھا، کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔

رقیہ نے جاتے وقت تاکید کر دی تھی، دروازہ اندر سے بند کر لیا جائے چنانچہ شکورن کی ماں کے آنے کے بعد صبیحہ نے اندر کنڈی لگا لی تھی، تھوڑی دیر کے بعد کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی، شکورن کی ماں نے کہا۔

"جاؤ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے دیکھنا تو بیٹی؟"

صبیحہ ڈرتے ڈرتے دروازے کے پاس گئی،

"کون ہے؟"

جواب نہیں ملا، لیکن دستک کی آواز پھر سنائی دی، اب تو وہ گھبرائی کہ یہ کون شخص ہے جو دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، لیکن بتاتا نہیں کہ کون ہے؟ صبیحہ نے اب کے ذرا زور سے پوچھا،

"کون ہے"؟

ایک نامانوس سی آواز آئی جس میں تحکم بھی شامل تھا،

"دروازہ فوراً کھولو!"

تو تو دیوانی ہے اچھی خاصی، دوست کون ایسا بیٹھا ہے جو اتنی دیر تک انہیں بٹھائے رکھے گا میں جانتی ہوں، ان کے دشمنوں کو خدا نخواستہ کہیں کوئی بات نہ ہو گئی ہو؟"

اور یہ کہہ کر وہ چھکوں پھکوں رونے لگیں، ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اور سیل اشک رواں ہو گیا،

صبیحہ ماں سے لپٹ گئی اور بولی،

"میری اچھی امی روئیے نہیں، ابا جی بس اب آتے ہی ہوں گے؛"

لیکن یہ کہتے کہتے خود اس کی آواز بھی بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی صورت میں موتی کی لڑیاں گرنے لگیں، آخر رقیہ نے برقع اوڑھا صاف معلوم ہو رہا تھا، کہیں باہر جانے کا پروگرام ہے، صبیحہ نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

"امی کہاں جا رہی ہیں آپ؛

رقیہ نے برقع کا بند ٹھیک کرتے ہوئے کہا،

"شاید ان کا استعفا مالک نے منظور نہ کیا ہو، اور وہیں کام کرنے بیٹھ گئے ہوں، بے پروا تو ہیں ہی، لیکن مجھے تو قرار نہ آئے گا، جب تک معلوم نہ ہو جائے، ابھی آجاؤں گی ذرا دیر میں، پڑوس سے فنکورن کی ماں کو بلائے لیتی ہوں، وہ تیرے پاس بیٹھی رہیں گی۔ !

یہ کہہ کر رقیہ بیگم باہر نکلیں، صبیحہ نے انہیں منع کرنا چاہا، لیکن منع نہ کر سکی، اتنے میں فنکورن کی ماں آگئی، یہ ایک بوڑھی عورت تھی، آتے ہی

اس شان سے کہ یا باہر نکلو یا ہمیں اندر بلاؤ، ہو نہ ہو یہ شخص بیگم صاحبہ (رقیہ) سے ملنے آیا ہے، لیکن ان سے ملنے بھی اس وقت کون آسکتا ہے، اتنے میں پھر وہی آواز آئی،

"کھولو، ورنہ میں دروازہ توڑ دوں گا!"

صبیحہ شکورن کی ماں سے لپٹ گئی،

"ہائے اللہ اب کیا ہوگا، یہ کون ہے؟"

شکورن کی ماں خود ہی یہ نادر شاہی حکم سُن کر تپ ولرزہ میں مبتلا تھیں وہ کیا جواب دیتیں، پھر اپنے حواس بجا کرتی ہوئی بولیں،

"آخر تم ہو کون؟"

جواب ملا،

"سامنے آؤ، پہچان لو، ہم کون ہیں؟!"

شکورن کی ماں نے کہا

"لیکن یہاں کوئی نہیں ہے۔ نعیم میاں باہر گئے ہیں؟"

آواز آئی،

"تم تو ہو، ہمیں نعیم میاں سے نہیں تم سے ملنا ہے!"

آخر جب کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی تو شکورن کی ماں نے ایک رشتہ پیدا کرکے اس آدمی کو رام کرنا چاہا، کہنے لگیں

"بیٹا، میں ہوں شکورن کی ماں!"

اس مرتبہ کوئی جواب نہیں ملا، اور دروازہ اس شخص نے زور زور

صبیحہ دھم دھم کرتی، دوڑتی ہوئی شکورن کی ماں کے پاس پہنچی، اس نے کھانستے کھانستے سر اٹھا کر پوچھا،

کون ہے بیٹی ؟"

صبیحہ نے جواب دیا۔

"نہ جانے کون ہے، دروازہ کھٹکھٹائے جا رہا ہے۔"

شکورن کی ماں نے کہا۔

"تو بیٹی نام پوچھ لیتیں تو کون سا غضب ہو جاتا"

صبیحہ نے بتایا۔

"پوچھا تو تھا، لیکن وہ نام بتاتا ہی نہیں، بڑے حاکمانہ لہجہ میں کہہ رہا ہے، دروازہ کھولو!"

یہ سن کر بڑی بی بھی سٹ پٹا گئیں، لیکن ہمت کر کے دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں پر زور دے کر کھانستی ہوئی اٹھیں اور دروازہ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں، صبیحہ بھی ساتھ تھی، کہنے لگیں۔

"یہ نعیم میاں، کا گھر ہے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

نامانوس سی آواز آئی،

"تم سے صرف تم سے، یا تو دروازہ کھول کر باہر چلی آؤ، ورنہ ہمیں اندر آنے دو۔"

یہ سن کر شکورن کی ماں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، سوچنے لگیں بھلا مجھ سے ملنے، اس گھر میں، اتنے وقت کون آنے لگا، اور وہ بھی

سے بھر بھڑانا شروع کیا، واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا، شکورن کی ماں نے کانپتے ہوئے صبیحہ کی طرف دیکھا، اور صبیحہ نے بے بسی کے ساتھ اسے دیکھا، دونوں خاموش تھیں، نہ دروازہ کھولتے بنتا تھا، نہ یہ ممکن تھا کہ نہ کھولیں، اب صبیحہ ہیں نہ جانے کہاں سے ہمت پیدا ہوگئی، اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا،

"جب تک آپ نام نہیں بتائیں گے دروازہ نہیں کھولا جا سکتا!"

ان کے جواب میں ایک زوردار قہقہہ سننے میں آیا، صبیحہ نے پہچان لیا، یہ قہقہہ نعیم کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا، اس نے شکورن کی ماں سے کہا،

"ابا جی ہیں، دروازہ کھول دو!"

لیکن شکورن کی ماں کو یقین نہ آیا،

"بیٹی ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، میں نہیں کھولنے کی، کیا میں نعیم میاں کی آواز نہیں پہچانتی!!"

صبیحہ نے بڑی بی سے الجھنا مناسب نہ سمجھا، خود آگے بڑھ کر کنڈی کھول دی، نعیم مسکراتا ہوا داخل ہوا، صبیحہ نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا،

"ابا جی آپ نے تو ہمیں ڈرا دیا۔

نعیم نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا،

"ڈرنے کی کیا بات تھی؟" اور اگر تم ڈر گئی تھیں تو اس گھر میں وہ جو ہیں رستم داستان رفیقہ بیگم صاحبہ، کیا وہ ابھی سے گھوڑے بیچ کر سو گئیں؟ وہ کیوں نہیں آئیں؟

صبیحہ نے بتایا،

"وہ تو آپ کو تلاش کرنے گئی ہیں"

نعیم سنجیدہ ہو گیا،

"مجھے تلاش کرنے گئی ہیں؟"

صبیحہ نے جواب دیا۔

"جی، ابا جی! وہ رو رہی تھیں، میں نے لاکھ سمجھایا، مگر ان کے آنسو تھمتے ہی نہیں کسی طرح، اُن کی زبان پر تو صرف ایک ہی بات تھی، دوپہر کے گئے ہوئے اب تک رات کے نو بجے تک کیوں نہیں آئے، ضرور خدانخواستہ کوئی بات ہو گئی، کھانا تو بڑی چیز ہے، سہ پہر کی چائے تک نہیں پی انہوں نے، آپ نے بھی تو غضب کر دیا"

نعیم نے پوچھا:۔

"میں نے کیا غضب کر دیا بیٹی؟"

وہ کہنے لگی،

"جب نوکری چھوڑ دی تھی تو اس طرح یکایک سارا دن اور اتنی رات تک غائب رہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب بیچاری برقعہ اوڑھ کر ہانپتی کانپتی آپ کے دفتر میں تلاش کرنے گئی ہیں کہ شاید آپ وہیں ہوں، وہاں نہ پا کر اُن کی کیا حالت ہو گی؟ جائیے جلدی سے لے آیئے انہیں!"

نعیم نے کہا،

"ہاں میں جاتا ہوں، لیکن تمہاری امی ہیں بڑی بے وقوف!"

صبیحہ نے جواب دیا،
"آپ ان کی محبت کی قدر نہیں کرتے، بیچاری کو بے وقوف کہتے ہیں!"
پیچھے سے آواز آئی
"ہاں بھئی میں تو بے وقوف ہوں اور پاگل بھی!"
نعیم نے مڑ کر دیکھا تو رقیہ بے حال پریشان و مضطرب کھڑی تھی،
نعیم نے بڑے تاثر کے عالم میں کہا،
"رقیہ تم کیوں اس قدر پریشان ہو گئی تھیں؟"
رقیہ نے جواب دیا،
"غلطی ہوئی!"
نعیم ہنسنے لگا،
"وہی طنز"
رقیہ نے کہا۔
"طنز تمسخر سے بہتر ہوتا ہے، میں نے تو صرف طنز کیا، آپ تو میرا مذاق اڑا رہے ہیں!"
نعیم نے رقیہ کے دونوں بازو اپنے ہاتھ میں جکڑ لئے، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
"یہ تم کہہ رہی ہو؟"
وہ ہاتھ چھڑاتی ہوئی زیر لب تبسم کے ساتھ گویا ہوئی،

"ہٹیئے بھی!"

نعیم نے کہا۔

"رقیہ ہو بڑی قسمت والی، سوا سو کی نوکری چھوٹی اور فوراً ہی دو سو کی مل گئی، اور پچاس بہ مد پیشگی بھی وصول ہو گئے، اور میں تمہارے لئے ایک ساڑی بھی لیتا آیا، اور صبیحہ کے لئے ایک نائیلون کا دوپٹہ بھی، !"

یہ کہہ کر نعیم نے دوپٹہ صبیحہ کو تھمایا، اور ساڑی رقیہ کے حوالہ کی، رقیہ کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی،

"اس کی کیا ضرورت تھی؛ اپنی اچکن بنا لی ہوتی؛"

صبیحہ نے کہا۔

"کتنا اچھا دوپٹہ لائے ہیں ابا جی، دیکھنا امی!"

رقیہ نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے کہا،

"ہاں بڑا اچھا ہے!"

نعیم نے کہا،

"سخت بھوک لگی ہے صبیحہ کھانا نکالو۔"

وہ کھانا نکالنے چلی گئی، نعیم نے باقی آٹھ روپے رقیہ کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہا۔

"میری رائے ہے ان جڑی بی (شکورن کی ماں) کو ایک روپیہ دے دو دعائیں دیں گی، ——— !"

رقیہ نے ایک روپیہ شکورن کی ماں کو دے دیا، اس نے واقعی روپیہ پاتے ہی دعاؤں کا ڈونگرا برسا دیا۔

اس لئے کہ وہ اصول اور صداقت پر مبنی ہوتی تھی، نہ کسی کی رعایت، نہ کسی سے کد، بہت جلد نیرنگ کا شمار باوقار اخبارات میں ہونے لگا، یوسف اس کامیابی کا سہرا نعیم کے سر باندھتا تھا، اور بات بھی یہی تھی، یہ ساری ترقیاں اور سرفرازیاں نعیم ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھیں، یوسف کا قیام پہلے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تھا جس کا کرایہ تیس روپے ماہوار تھا، اب وہ شہر سے باہر ایک چھوٹی سی کوٹھی میں اٹھ آیا تھا جس کا کرایہ دوسو روپیہ ماہوار خوشی سے ادا کرتا تھا، پہلے وہ بس میں سفر کرتا تھا، اور دھکے کھانے میں اس کا کافی وقت صرف ہو جاتا تھا، اب اس نے ایک چھوٹی سی سکنڈ ہینڈ موٹر خرید لی تھی، جسے خود ڈرائیو کرتا تھا، اخبار کا دفتر پہلے ایک نہایت کہنہ اور خراب سی عمارت میں تھا، اب وہ ایک نئی اور خوبصورت عمارت میں منتقل ہو گیا تھا، دفتر کا فرنیچر پہلے چند ٹوٹی پھوٹی کرسیوں، میزوں، اور اسٹولوں پر مشتمل تھا، اب فرنیچر بالکل نیا ہو گیا تھا، یوسف کے کمرہ میں صوفہ سیٹ بھی آ گیا تھا، غرض اب یہ ایک شاندار اخبار کا شاندار دفتر تھا۔

ان ترقیوں کے ساتھ ساتھ، اسٹاف اور عملہ کے دوسرے لوگ بھی محروم نہیں رہے۔ چپڑاسی کی تنخواہ میں پانچ کا، سائیکلسٹ کی تنخواہ میں دس کا، مترجم کی تنخواہ میں پچیس کا، کلرک کی تنخواہ میں تیس کا، اور نعیم کی تنخواہ میں سو روپیہ کا اضافہ ہو گیا، اب اُسے تین سو روپے ماہوار مل رہے تھے،

(۵)

نعیم کی شب و روز کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیرنگ کی اشاعت میں غیر معمولی اضافہ ہوا، وہی اخبار جو مشکل سے پانچسو بکتا تھا۔ اب اس کی اشاعت پانچہزار تک پہنچ گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتہارات میں بھی اضافہ ہوا، اور اُن کا زخ بھی بڑھ گیا، پہلے بدقت تمام، آٹھ آنے انچ پر اشتہار ملتا تھا وہ بھی سو پھیرے، اور ہزار خوشامدیں کرنے کے بعد، اب بے مانگے، اور بے منت اشتہاری ایجنسیوں کی طرف سے تین روپے انچ کے زخ پر اشتہارات ملنے لگے تھے، پہلے اشتہارات ازراہِ احسان و غریب پروری دیئے جاتے تھے آج دوسرے اخبارات کے مقابلہ میں ان کا ساز کم ہوتا تھا، اب استحقاق کی بنا پر ملتے تھے، لہٰذا دوسرے اخبارات کے مقابلہ میں ساز یکساں ہوتا تھا، پہلے نیرنگ کے افکار و آرا پر کوئی توجہ نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ نہ اُن میں دلائل ہوتے تھے، نہ وزن ہوتا تھا، اب اس کی نکتہ چینی کا خیر مقدم کیا جاتا تھا

رقیہ بیگم نے پھر سوال کیا،

"تمہاری آمدنی کس طرح خرچ ہوتی ہے؛ ——— کون خرچ کرتا ہے؟"

اس سارے سوال کا سادہ سا جواب موجود تھا،

"تم ——— مجھے تو جو کچھ ملتا ہے تمہیں لا کر دے دیتا ہوں۔ تم ہی سارا گھر چلاتی ہو، حیرت ہوتی ہے اس گرانی کے زمانہ میں اتنا اچھا انتظام کر لیتی ہو، ؟"

وہ بولی،

"تو پھر یہ فکر مجھے پہنچنا چاہیئے۔ تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؛ میں جانوں اور میرا کام؛"

نعیم صاحب خوش ہو گئے،

"تو میں کچھ فکر نہ کروں، تم سب کچھ کر لو گی؛"

رقیہ نے اطمینان دلایا،

"کیوں نہیں کروں گی، تم تو مفت میں پریشان ہوا کرتے ہو!"

نعیم نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

"واہ بھائی واہ بیوی ہو تو ایسی ہو!" ——— صبیحہ —!

اس نے جواب دیا۔

"جی اباجی، آئی،"

وہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

نعیم کا یہ معمول تھا کہ وہ ساری تنخواہ لاکر بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتا، اور خوش قسمتی سے بیوی بھی اتنی سوگھڑ تھی کہ تین سو میں اس ٹھاٹھ سے رہتا کہ ہزار روپے ماہوار کمانے والے بھی نہیں رہتے ہوں گے!

ایک روز نعیم کی بہن کے ہاں سے نیوتہ آیا، بھانجی کی شادی تھی، نعیم کی ایک بہن تھیں اور وہ اپنی بھانجی میمونہ کو بہت چاہتے تھے، نیوتہ پاکر وہ مغموم سے بیٹھ گئے۔ رقیہ نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

کہنے لگے،

"سوچ یہ رہا ہوں کہ میمونہ کی شادی ہو رہی ہے!"

رقیہ کو ہنسی آگئی،

"تو یہ خوشی کا موقع ہے یا فکر کا؟"

کہنے لگے،

"ہے تو خوشی کا، لیکن ایک ہی بہن ہے اور اس کی یہ اکلوتی لڑکی ہے، یہاں ہاتھ بھی خالی، نہ جاؤں تو سارے خاندان میں بدنام، جاؤں تو کیا منہ لے کر جاؤں؟"

رقیہ نے شوہر کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور کہا،

"یہ بتاؤ اپنی ساری آمدنی کیا کرتے ہو؟"

نعیم کو اس سوال پر حیرت ہوئی،

"میں سمجھا نہیں اس سوال سے تمہارا مطلب کیا ہے؟

نعیم نے کہا۔
"بیٹی فخر کر اس ماں پر، خدا دشمن کو بھی ایسی بیوی عطا کرے،
جیسی یہ ہیں!"
صبیحہ حیرت سے باپ کی ان بے تکی باتوں کو سننے لگی، رقیہ کو ہنسی
آ گئی،
"اچھا اب تم جاؤ اپنا کام کرو!"

چند روز کے بعد جب میمونہ کی شادی کا دن آیا تو رقیہ، صبیحہ، اور نعیم سب ہی شریک ہوئے، اس موقع پر رقیہ نے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا ریشمی جوڑا، سونے کے بندے، جاپان کا بنا ہوا چائے کا ایک سیٹ، اور ایک خوبصورت سا عطردان دلہن کو اپنی اور نعیم صاحب کی طرف سے دیا، دوسرے عزیزوں کی طرف سے جو تحفے اور ہدیے ملے تھے، ان میں سب سے زیادہ اور گراں مایہ تحفہ رقیہ کا تھا، نعیم صاحب بیوی کے اس کارنامہ پر پھولے نہ سمائے، انہیں واقعی یہ توقع نہ تھی کہ وہ یہ کچھ کر سکے گی، شادی کے مرحلہ سے فراغت کے بعد جب گھر واپس آئے تو رقیہ سے کہنے لگے،
"بھئی کمال کر دیا تم نے؟"
رقیہ سمجھ تو گئی اشارہ کس طرف ہے، پھر بھی انجان بن کر پوچھنے لگی
"کیا کمال کر دیا میں نے؟"
کہنے لگے :۔

"ریشمی جوڑا، سونے کے بندے، چلئے کا سیٹ، عطر دان، یہ آ
ساری چیزیں کہاں سے لی آئیں تم ؟"

رقیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا،

"چوری کر کے، !"

نعیم نے کہا،

"ایسا معلوم ہوتا ہے، تم چپکے چپکے مستقبل کے انتظامات کرتی رہتی ہو
یہ اچھی عادت ہے، لیکن اس کا اثر صبیحہ کے جہیز پر تو نہیں پڑے گا!"

رقیہ نے جواب دیا،

"آپ صبیحہ کے جہیز کی فکر نہ کیجئے، یہ میرا کام ہے، میں کروں گی
آپ تو اس کے لئے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کیجئے، ماشاءاللہ لڑکی سیانی
ہو گئی ہے!"

نعیم نے سر کھجاتے ہوئے کہا،

"بھئی ابھی نہیں، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے ؟"

یہ سن کر رقیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی،

"آپ کے نزدیک تو میں بھی ابھی بچہ ہوں

نعیم نے قہقہہ لگایا،

"بھئی واہ کیا مزے کی بات کہی ہے، کیا کہا تم
ابھی بچہ ہو، نعیم کی بیوی، رقیہ کی ماں ۴۵ سال کی عمر میں بچہ ہے ؟
ہاہا

رقیہ کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا،

"ہر بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کیا کیجئے۔ کبھی سنجیدہ بھی بن جایا کیجئے۔ زندگی بسر کرنے کے یہ لچھن نہیں ہوتے جو آپ کے ہیں!"

نعیم نے دیکھا بات ذرا بگڑ چلی ہے،

"بھئی جو تم کہتی ہو وہی ہوگا، ذرا چھری تلے دم تو لینے دو۔ ہتھیلی پر سرسوں بھی کہیں جمی ہے؟"

کارگاہِ ہستی

——"بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل"!

(۱)

صبیحہ میں اب شعور پیدا ہو چکا تھا، وہ اب ایک الھڑ اور نادان لڑکی نہیں تھی، جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی! اس میں وقار تھا، خودداری تھی، دوسروں کے دکھ درد پر تڑپنے والے دل کی وہ مالک تھی، باپ کی طرح منہ پھٹ، بے فکر اور سارے عالم سے بے پروا نہیں تھی، نہ ماں کی طرح اپنی دنیا صرف گھر کی چار دیواری کے اندر محدود رکھتی تھی۔ قدرت نے اسے چشم بینا دی تھی اور وہ کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی تھی، قدرت نے اسے حساس دل بخشا تھا اور اس دل میں اپنوں اور غیروں، دوستوں اور دشمنوں سب کا درد تھا، قدرت نے اسے فہم و خرد عطا کی تھی، اور خدا کی دی ہوئی ان نعمتوں سے وہ کام لینا بھی خوب جانتی تھی،

وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھی، خوشی کی کوئی بات ہوتی تو پھول کی طرح کھل جاتی، ہنسی روکے نہ رکتی، خوشی کے دھارے اس کی چمکدار

آنکھوں سے پھوٹنے لگتے، اس کے رخِ روشن پر ایسی تابانی آجاتی کہ معلوم ہوتا اسے دولتِ کونین مل گئی ہے، غم کی کوئی بات ہوتی، تو نہ دل قابو میں رہتا نہ آنکھیں، دل تڑپتا، آنکھیں روتیں، کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر اس کا جی چاہتا یہ مصیبت اس سے چھین لے، اور اس کے بجائے خود اسے جھیل لے، کسی فقیر کو دیکھ کر وہ اپنی سماج کو کوسنے لگتی، اس کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں تھا کہ کچھ لوگ، قورمہ اور شامی کباب کھائیں شراب پئیں، عیش کریں موٹر میں بیٹھیں، سینما دیکھیں، روپے کی جگہ اشرفی خرچ کریں، اور کچھ لوگ محنت مشقت کے باوجود فاقے کریں، اپنے بچوں کو تعلیم نہ دلا سکیں، بیمار پڑیں تو علاج کی استطاعت نہ رکھیں، عید یا کوئی تہوار آئے تو کپڑے تک نہ بنا سکیں، وہ کہتی تھی: ایسے معاشرے کو ختم ہو جانا چاہیے

اپنی جنس سے اُسے غیر معمولی محبت تھی، جب کسی عورت کو وہ فقر و فاقہ کی حالت میں دیکھتی تو اس کا دل رونے لگتا، کسی لڑکی کو جب وہ اپنے یا دوسروں کے ہاں ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتے دیکھتی، تو اس کا جی چاہتا، اُسے بھی وہی زندگی بخش دے جو گھر کے دوسرے بچوں کو حاصل ہے ——— خوشی، بے فکری، نہ غمِ امروز، نہ فکرِ فردا، !

جب اخبارات میں کوئی ایسی خبر اس کی نظر سے گزرتی جو عورت کی مظلومیت، اور بے بسی کا آئینہ ہوتی تو وہ لرز جاتی، اس کا جی چاہتا ایسے مردوں کا منہ نوچ لے جو محض مرد ہونے کے زعم میں اپنی بیوی کو، بہن کو، بیٹی کو، ماں کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں، انہیں دکھ دیتے ہیں،

ان کا حق مارتے ہیں، انہیں زدوکوب کرتے ہیں، ان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے ہیں، جی چاہتا ہے تو قتل تک کر ڈالتے ہیں،

وہ سوچتی جب تک عورت کو وہی حق نہیں ملے گا جس کی وہ مستحق ہے، اس وقت تک نہ ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے نہ سماج، اس وقت تک ہماری نسلوں کی مٹی پلید ہوتی رہے گی، اس وقت تک آنے والی نسلوں کا حال اور مستقبل برباد ہوتا رہے گا،

لیکن اس وسیع دنیا میں اسے دنیا کوئی ہمدم اور دمساز، غم خوار اور مزاج داں نظر نہ آتا ——————— !

وہ دیکھتی اور دیکھ کر کڑھتی کہ خود عورتوں تک میں اپنی سقیم حالت اپنی مظلومیت اور اپنی بے بسی کا کوئی احساس نہیں ہے، عورت پر جب تک خود کوئی دقت نہ پڑے، دوسری عورتوں سے اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی ان سوتے ہوؤں کو کس طرح جگایا جائے؛ ان نیند کے ماتوں کو کیونکر ہوشیار کیا جائے؟

اس کے دن اور راتوں کا بڑا حصہ انہی تخیلات میں گذرتا، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا اسے رات رات بھر نیند نہ آتی، صبح جب اس کی مخمور آنکھیں دیکھ کر ماں سوال کرتی،

"بیٹی تیری آنکھیں سرخ کیوں ہیں، کیا رات کو نیند نہیں آتی تجھے؟"

تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی، ٹال دیتی، کوئی بہانہ کر دیتی

(۲)

گھر میں ایک ملازمہ تھی رحیمن، عمر کوئی ۳۴، ۳۵ سال کی ہوگی، نک سک سے درست، بڑی کارگزار، بڑی محنتی، صبح تڑکے آتی، رات کو کافی دیر میں واپس جاتی، اس کا شوہر نکھٹو تھا، افیم کا عادی، جوئے کا رسیا، بیوی کے بجائے شراب کا عاشق، کوئی کام نہ کرتا، کسی طرح کی ذمہ داری نہ محسوس کرتا، اپنے جیسے بے فکروں کے مجمع میں بیٹھا دن بھر تاش کھیلتا رہتا، رحیمن جب کھانا لے کر آتی تو ڈٹ کر کھاتا اور اس کی ذرا پروا نہ کرتا کہ وہ بھوکی رہ جائے گی، یا اُسے فاقہ کرنا پڑے گا، پھر سگریٹ سلگاتا "عزیز" کے لئے دو چار پیسے وصول کرتا اور یاروں کے مجمع میں جا پہنچ جاتا ———— وہی قہقہے، وہی تاش کی بازیاں، وہی جوا، وہی شراب!

رحیمن شوہر کے یہ لچھن دیکھتی اور ایک آہ سرد بھر کر خاموش ہو جاتی

اپنی ماں کو وہ بہت زیادہ چاہتی تھی، لیکن اپنا رازداں نہیں سمجھتی تھی، وہ جانتی تھی، جو باتیں میں سوچتی ہوں وہ اماں کی فہم سے بالاتر ہیں ——————

وہ بیچاری ان باتوں کا جواب کیا دیتی، رونے لگی، اس نے اپنی صفائی دینے کی کوشش بھی نہیں کی، کسی بھکارن کی طرح ہاتھ پھیلا کر کہا

"بی بی جی پانچ روپے دے دو!"

یہ سنکر رقیہ نے ایسا محسوس کیا، جیسے کسی نے پانچ جوتے اس کے منہ پر لگا دیئے ہوں، شیرنی کی طرح بپھر کر کہا،

"پانچ روپے دے دوں؟ ——— انعام؟ دیر میں آنے کا، کام نہ کرنے کا، حرام خوری کا انعام ——— ؟ اور اگر تنخواہ مانگتی ہو تو اُلٹے تین روپے تم پر نکلتے ہیں ———"

رحیمن نے حساب فہمی کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔

"کاٹ لینا بی بی جی!"

رقیہ کو اس کی یہ ضد دیکھ کر تاؤ آ گیا،

"چل دور دفع، ——— یہاں کوئی کھاتہ کھولے بیٹھا ہے!"

رحیمن نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا،

"تو کیا چلی جاؤں؟"

رقیہ نے جواب دیا۔

"نہیں بھائی اس دھوپ میں جاؤ گی، تو یہ پھول سا چہرہ کملا نہ جائے گا۔ میرے کمرہ میں چلی جاؤ بستر لگا ہوا ہے، اس پر آرام کرو، گرمی لگے تو پنکھا کھول لینا، روح افزا کا گلاس بنا کر ابھی صبیحہ کے ہاتھ بھیجتی ہوں، اتنی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا، پھر سر پھر کی جائے پی کر ٹھنڈی

شوہر کی بے راہ روی کا خیال جب زیادہ تنگ کرتا تو اور زیادہ محویت اور محنت کے ساتھ کام کرنے لگتی اکہ شاید یہ مصروفیت خیال اور احساس کی شدت کو کم کر دے،

ایک روز خلاف معمول رحیمن دس بجے صبح تک نہیں آئی، مجبوراً سارا کام صبیحہ کو کرنا پڑا، کیونکہ وہ حتی الامکان اپنی ماں کو کام کرتے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی، اس نے جھاڑو دی، برتن مانجے، ناشتہ تیار کیا، اور اب کھانا پکا رہی تھی،

کوئی گیارہ بجے کے قریب رحیمن آئی، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی، ہونٹ خشک ہو رہے تھے، بال پریشان دوپٹہ ڈھلکا ہوا،

رقیہ نے رحیمن کو دیکھتے ہی جوتی سنبھالی،

"اب آئی ہیں بیگم صاحبہ ——— کہیئے"

مزاج تو اچھا ہے؟"

وہ اس طنز کو نظر انداز کر گئی،

"بیگم صاحب ——— بڑی بری حالت ہے؟"

رقیہ نے کہا،

"اچھی بھلی تو کھڑی ہے، بری حالت کہاں سے ہو گئی؟ یہ کیوں نہیں کہتی روٹیاں لگ گئی ہیں؛ تو یہاں کوئی زبردستی تو ہے نہیں، نہیں نوکری بہت، ہمیں نوکر بہت"

(۳)

رحیمن جب مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں رقیہ خانم سے رخصت ہو کر دروازہ کے پاس پہنچی، یہاں اُس کے استقبال کے لئے صبیحہ کھڑی تھی۔

"رحیمن سنو تو ذرا ایک بات!"

رحیمن نے جلدی جلدی آنسو پونچھے اور صبیحہ کی "ایک بات" سننے کے لئے کھڑی ہو گئی،

صبیحہ نے پوچھا،

"تمہیں روپے چاہئیں"

وہ بولی،

"جی —— پانچ ——"

صبیحہ نے کہا،

"پانچ نہیں دس، —— لیکن کیوں؟"

ٹھنڈی چلی جانا ـــــــ اے میں کہتی ہوں دفع ہو گی مالزادی یا اُٹھ کر لگاؤں دو جوتے ؛"

رحیمن کو روپیوں کی ضرورت تھی، جوتوں کی نہیں اس نے زہر میں بجھے ہوئے ان الفاظ کا کوئی جواب نہیں دیا، کہنے لگی،

"اچھا ـــــــ"

اور پھر اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی، اس کا گلا رندھ گیا،

رقیہ نے کہا،

"بہت اچھا ـــــــ جائیے تشریف لے جائیے، اور ہاں کان کھول کر سن لیجئے۔ اگر کل بھی آپ کی سواری نہ آئی تو ہم دوسرا انتظام کر لیں گے!"

اور پھر انہوں نے اپنا تکیہ کلام دہرایا،

"نہیں نوکری بہت، ہمیں نوکر بہت!"

دلتا رہے گا ،!

رحیمن باتوں میں زیادہ وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی تھی ، اس نے کہا

"تم ہی دے دو پانچ روپے !"

صبیحہ نے پوچھا

"واپس کب کرو گی ؟"

اس نے جواب دیا۔

"میری تنخواہ سے کاٹ لینا ، ایک روپیہ مہینہ کرکے !"

صبیحہ کو پھر ہنسی آگئی ،

"پانچ روپے پانچ مہینہ میں ؟"

وہ روہانسی ہو کر بولی ،

پھر اور کیا کروں ؟"

صبیحہ نے کہا ،

"اچھا چلو پانچ مہینے بھی منظور ، یہ بتاؤ نفع کیا دو گی ؟"

وہ پھر رونے لگی ،

"نفع کہاں سے دوں ؟ میرے پاس ہے کیا ، چاندی کی دو بالیاں تھیں وہ بھی بک گئیں !"

صبیحہ نے ہمدردی کے ساتھ دریافت کیا ،

"کیوں نہ بیچ دیں ؟"

"پھر دوا کہاں سے لاتی ، ؟"

اس کی آنکھیں پھر آب گوں ہو گئیں اس نے کہا

وہ بیمار ہے

"کون؟ ——— شفقت، تیرا شوہر؟"

"جی وہی!"

"کیا بیمار"

"پہلے تو بخار آیا، اب ڈاکٹر کہتے ہیں نمونیہ ہو گیا!"

"لیکن وہ تو تجھے مارتا ہے، لوٹتا ہے، خود کھاتا ہے۔ تجھے بھوکا رکھتا ہے۔!"

"اس سے کیا ہوتا ہے، میرا سہاگ اس کے دم سے قائم ہے، وہ نکھٹو ہے لیکن میرا سہارا تو ہے ——— جب سے وہ بیمار پڑا ہے، حرام ہے جو ایک لقمہ بھی میں نے کھایا ہو!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"کیا کہنا ہے ہماری زمین کے رسم و کرم کا! اسی طرح تو یہ مرد وے بگڑتے ہیں، تجھے چاہیئے رگڑنے دے ایڑیاں، پھر قدر ہوگی تیری،

وہ بولی۔

"نہیں میں اپنی قدر کرانا نہیں چاہتی، میری تمنا تو صرف یہ ہے کہ وہ اچھا ہو جائے، جوا کھیلے یا شراب پیئے!"

صبیحہ نے پھر چھیڑا۔

"پھر وہ بھی ٹھیک نہیں ہو گا، ہمیشہ اسی طرح تیرے سینہ پر کود دال

وہ جانے لگی تو صبیحہ نے کہا،

"یہ قرض نہیں ہے!"

اس نے ایک مرتبہ پھر پلٹ کر اسے دیکھا، اور چلی گئی!"

"کتنے میں فروخت کیں؟"

"پانچ روپے میں!"

صبیحہ کے چہرے کا آثار چڑھاؤ بتا رہا تھا وہ سخت ذہنی کوفت میں مبتلا ہے، اس نے رحیمن کی یہ باتیں سنکر کہا،

"اچھا میرے ساتھ آؤ!"

وہ رحیمن کو اپنے کمرہ میں لے گئی، کرسی پر بیٹھ کر میز کے خانہ سے لیٹر پیڈ نکالا، اور خط لکھنے لگی، رحیمن سخت پریشان تھی یہ کیا ہو رہا ہے؛ بھلا خط لکھنے کا یہ کون سا وقت ہے؛ لیکن روپے لینا تھے، چار و ناچار کھڑی رہی، صبیحہ نے خط لکھ کر لفافہ میں بند کیا اور رحیمن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈاکٹر سلطان کو دے دینا، جس دوا کی ضرورت ہوگی، وہ تم سے دام لئے بغیر دے دیں گے، چاہے جتنی قیمتی ہو، تم فکر نہ کرو، خدا نے چاہا تو شفقت اچھا ہو جائے گا، اچھا ہو جائے تو ذرا میرے پاس لانا، میں خبر لوں گی کہ تیری جیسی بیوی کی بھی وہ قدر نہیں کرتا، حالانکہ کوئی شریف آدمی ہوتا تو پوجتا۔"

پھر اس نے پرس کھول کر پانچ پانچ کے تین نوٹ نکالے اور رحیمن کی طرف بڑھا دیئے،

"لو ——— خرچ کرو!"

رحیمن نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا اور نوٹ لے لئے، جب

"آخر تم اس کی ہمدرد کیوں ہو؟"

وہ بولی،

"اس لئے کہ وہ بھی ہماری طرح انسان ہے!"

رقیہ خانم کو اور زیادہ غصہ آگیا،

"نہ کاٹی ہو تنخواہ جب کہنا!"

صبیحہ نے آہستہ سے کہا۔

"اماں جی ایسا غضب نہ کیجئے گا، پچھلے مہینہ اباجی بیمار ہو گئے تھے اور کئی دن تک دفتر نہ جا سکے تھے، آپ کتنا ڈر رہی تھیں، کہیں تنخواہ نہ کٹ جائے؛ ———— کٹ جاتی تو کتنی تکلیف ہوتی آپ کو؟"

رقیہ نے تیکھی نظروں سے باغی بیٹی کو دیکھا،

"ہاں تو ————"

وہ خوشامدانہ لہجہ میں گویا ہوئی ———— لے اور ترنم کے ساتھ۔

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا،
کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

———— !

اور پھر وہ ہنستی ہوئی آئی اور ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگی۔

(۴)

ایک ہفتہ تک پھر رحیمن نے صورت نہ دکھائی!
گھر کے سارے کام کا بوجھ صبیحہ کے دستِ نازک اور دوشِ ناتواں پر آ پڑا تھا،
صبح سے شام تک صبیحہ کو مصروف دیکھ کر رقیہ خانم کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلکنے لگتا، ایک روز فرمایا،
"میں کہتی ہوں آخر وہ نمک حرام کہاں مر رہی جا کر؟"
صبیحہ نے مسکرا کر جواب دیا
"اماں جی وہ تو اچھی ہے اس کا شوہر بیچارہ ضرور مر رہا ہے، دُعا کیجئے خدا اسے تندرست کر دے، اور اتنی قوت دے کہ پہلے سے زیادہ قوت اور جوش کے ساتھ اپنی وفادار بیوی کی پٹائی کر سکے ما!"
رقیہ خانم نے جل کر پوچھا۔

مزدور جب اپنے اوقاتِ معیّنہ کے علاوہ کام کرتا ہے، تو اسے الگ سے تنخواہ کے علاوہ دوگنی اُجرت ملتی ہے، اس کو اوور ٹائم کہتے ہیں!"

ایک نیا خطرہ رقیہ خانم کو اپنے گرد منڈلاتا نظر آیا، ٹھنڈی سانس بھر کر فرمایا،

"بس تو ٹھیک ہے ——— جب وہ آجائے تو یہ گر بھی اُسے سمجھا دینا اچھی طرح!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"اماں جی آپ تو خفا ہو گئیں ——— واہ!"

رقیہ خانم واقعی خفا ہو گئی تھیں، انہوں نے تلخ لہجہ میں فرمایا،

"خدا وہ دن لائے، جب اپنا گھر سنبھالنا تو منہ مانگا اوور ٹائم دیا کرنا نوکروں کو، ہم نے تو یہ نام آج ہی سنا ہے، ہم تو نہیں دے سکتے!"

پھر فیصلہ کن لہجہ میں ارشاد فرمایا،

"اگر کل بھی وہ نہ آئی تو میں دوسری ملازمہ کا انتظام کروں گی۔!"

صبیحہ نے بڑے مسکین لہجہ میں ماں سے کہا،

"کیا میرا نام آپ کو ناپسند ہے؟"!

ماں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو بیٹی کی آنکھیں پُرنم نظر آئیں منہ بنا کر کہا

"اونہ!"

پھر پان بنانے لگیں،

"اماں جی رحیمن کی مصیبت پر میرا دل بہت کڑھتا ہے، اس پر رحم کیجئے، غصہ نہ کیجئے، اسے معاف کر دیجئے، سزا نہ دیجئے، اس کی مدد کیجئے، برا بھلا نہ کہئے، اس کے کام آیئے، خدا آپ کے کام آئے گا خدا آپ پر رحم کرے گا، ———"

رقیہ نے آہستہ سے صبیحہ کی باہیں جو اب تک ان کی صراحی دار گردن میں حمائل تھیں، ہٹاتے ہوئے کہا،

"چلو ہٹو بھی، تمہیں نے اس حرامزادی کا دماغ خراب کیا ہے ——"

پھر نصیحت آمیز پیرایہ میں فرمایا،

"نوکر بہرحال نوکر ہے اسے زیادہ سر نہ چڑھانا چاہئے، اس طرح وہ بدتمیز اور کام چور ہو جاتا ہے!"

صبیحہ نے ان دلائل کی تردید نہیں کی،

"ہاں اماں جی یہ تو ٹھیک ہے لیکن رحیمن ایسی نہیں ہے دیکھئے نا صبح تڑکے آجاتی ہے بیچاری، پھر رات گئے تک ایک پاؤں سے دوڑتی رہتی ہے، نہ دن کو دن سمجھے، نہ رات کو رات کبھی شکایت نہیں فریاد نہیں، گلہ شکوہ نہیں، نہ انعام کی طلب، نہ اوور ٹائم کا مطالبہ ———!"

یہ نیا لفظ سنکر رقیہ خانم چونک پڑیں،

"یہ اوور ٹائم کیا بلا ہے؟"

صبیحہ نے ایک استانی کی طرح ماں کو سمجھایا،

کام سے کام تھا، اور وہ ٹھیک طرح سے ہو رہا تھا،

رحمین کی نظریں بار بار صبیحہ کے کمرہ کی طرف جاتی تھیں اور اسے نہ پاکر مایوس واپس آتی تھیں، آج کالج سے وہ گھر نہیں آئی، سیدھی اپنی سہیلی کے ہاں چلی گئی، جہاں کوئی تقریب تھی، جب شام ہوگئی اور صبیحہ نظر نہ آئی تو رحمین نے رقیہ سے پوچھا،

"بٹیا نہیں دکھائی دیتیں، اب تو شام بھی ہوگئی!"

رقیہ بیٹھی قمیص کاکرتہ سی رہی تھیں، سوئی سے مشغلہ جاری رکھتے ہوئے کہا

"ہاں آج وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہے!"

"تو کیا رات کو آئیں گی؟"

"ہاں"

"اور کھانا؟"

"کھاکر آئے گی!"

"لیکن وہ تو کبھی باہر نہیں کھانا کھایا کرتی تھیں!"

"آج مجبور ہوگئیں!"

"میں نے انہی کے لئے شامی کباب بنائے تھے!"

"صبح کھالے گی!"

"باسی میں وہ مزا کہاں؟"

"چیز ٹھیک پکی ہو تو تازہ اور باسی میں کوئی فرق نہیں ہوتا!"

"اگر ذرا دیر میں آنے والی ہوں تو میں انتظار کروں؟"

(۵)

آج کئی دن کے بعد رحیمن اپنی "ڈیوٹی" پر واپس آئی تھی، اتنی خوش اتنی خوش، جیسے سیدھی جنت سے چلی آرہی ہے! باچھیں کھلی جارہی تھیں، بات پیچھے کرتی تھی مسکراتی پہلے تھی، کام میں ہمیشہ سے تیز دست تھی، لیکن آج تو ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کسی نے ایٹم کا پیوند لگا دیا ہے، اس کے تن نیم جاں میں وہ پھرتی، وہ تیزی، وہ مستعدی، وہ چلت پھرت کہ معلوم ہوتا جیسے آج گھر کا کام رحیمن نہیں بجلی کر رہی ہے،

رقیہ خانم سمجھ گئیں، یہ نشاطِ بے پایاں شوہرِ والا گوہر کے غسلِ صحت کی تقریب میں ہے، لیکن انہوں نے اس موضوع پر گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھی، اندیشہ تھا کہیں پرسش .... حسن طلب کا بہانہ ہو گئی تو اور مصیبت ہو گی، کم سے کم پانچ روپے تو دینا ہی پڑیں گے، انہیں اپنے

وہ خوشامدانہ لہجہ میں گویا ہوئی،

بی بی جی میں نے سارا کام کر لیا ہے، کھانا پکا لیا، برتن دھو کر رکھ دیئے، بٹیا (صبیحہ) کا بستر ٹھیک کر دیا، میز پونچھ دی، کمرہ جھاڑ دیا آپ کا، اور صاحب (نعیم) کا کمرہ بھی ٹھیک کر دیا، اب کوئی کام باقی نہیں ہے —————"

لیکن رقیہ خانم ان کارگزاریوں سے مطمئن نہ ہوئیں، ان کا اعتراض بدستور قائم تھا،

"ابھی تو بہت سویرا ہے، مغرب کی اذاں بھی نہیں ہوئی!"

رحیمن نے خوشامد کرتے ہوئے کہا،

"بی بی جی اذان تو نہیں ہوئی، لیکن بات یہ ہے کہ وہ اب اچھا ہو گیا ہے، لیکن چڑ چڑا ہو گیا ہے، غصہ پہلے ہی ناک پر رکھا رہتا تھا، اب مار تو سکتا نہیں، لیٹے لیٹے گالیاں دیتا رہتا ہے، اس سے اس کا سانس پھول جاتا ہے، وہ تھک جاتا ہے، میں جاؤں گی تو ذرا ہاتھ پاؤں دبا دوں گی، حقہ سلگا دوں گی، باتیں کرنے لگوں گی، پھر وہ سو جائے گا، ڈاکٹر نے کہا ہے انہیں غصہ مت دلانا، دیر میں جاؤں گی تو وہ خفا ہو جائے گا ————— جاؤں بی بی جی؟"

رقیہ نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا،

"جاؤ!!"

اس نے لب و لہجہ پر ذرا بھی غور نہ کیا، خوش خوش چلی گئی،

"وہ دیر میں آنے گی، ———— انتظار کیوں کرنا چاہتی ہو؟ کوئی کام ہے اس سے؟"

"نہیں بی بی جی کام تو نہیں، اتنے دن کے بعد آئی تھی دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا بٹیا کو!"

"کل سہی!"

"(مایوس ہو کر) ہاں پھر کل ہی سہی،"

اتنے میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی، رقیہ نے کہا،

"دیکھنا تو رحیمن کون ہے؟"

رحیمن باہر گئی، اور ایک لفافہ لا کر رقیہ کے ہاتھ میں رکھ دیا، رقیہ نے لفافہ کھولا، اس میں سے ایک کاغذ نکالا، اسے پڑھا، پھر گھور کر رحیمن کو دیکھا پھر پڑھا، پھر ایک شعلہ ریز نظر رحیمن پہ ڈالی، ایک مرتبہ اور سرسری طور پہ وہ کاغذ دیکھا، اس مرتبہ ان کی نظر جو رحیمن پہ پڑی، وہ نفرت، حقارت، برہمی اور غصہ کی تھی،

رقیہ پر یہ کیفیتیں طاری ہو رہی تھیں لیکن رحیمن نے نہ انہیں محسوس کیا، نہ اس طرف توجہ کی، رقیہ نے لفافہ بند کیا اور اپنے پاس رکھ لیا، رحیمن نے اجازت طلب کی،

"تو بی بی جی میں جاؤں؟ ————؟"

رقیہ نے ایک نگاہ غلط انداز رحیمن پر ڈالتے ہوئے پوچھا،

"ابھی سے؟"

(۶)

جب کبھی کسی قابلِ اعتراض فعل پر صبیحہ کی "خبر لینا" ہوتی، یا اسے زجر و توبیخ کرنا ہوتی، انورقیہ خانم ہمیشہ موقع کی منتظر رہتیں، یعنی نعیم کی موجودگی میں خاموش ہو جاتیں، کیونکہ وہ لامحالہ صبیحہ کا ساتھ دیتا، اس کے جانے کے بعد، پھر اچھی طرح دل کی بھڑاس نکال لیتیں،

صبیحہ سے بہت خفا تھیں، وہ خط پڑھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی، لیکن بدقسمتی سے صبیحہ اس وقت آئی، جب نعیم صاحب دفتر سے واپس آ چکے تھے، اب اگر کچھ کہتی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ صبیحہ تو الگ ہو جاتی میاں بیوی میں مہابھارت کی جنگ شروع ہو جاتی، مجبوراً وہ باپ بیٹی کے قہقہے اور چہچہے، خون کے گھونٹ پی پی کر برداشت کرتی رہیں، باپ بیٹی جب کھا پی کر بیٹھے تو اس طرح دُنیا جہان کے مسائل پر طنز و تعریض کرتے، جیسے ساری دُنیا احمق، نادان، ظالم، سفاک اور شقی ہے، صرف یہ دونوں

وہ ہیں، جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے ——— "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!"

صبح ناشتہ کے بعد جب نعیم چلا گیا، اور صبیحہ کالج جانے کی تیاریاں کرنے لگی، تو زینت خانم پیکرِ قہر و غضب بنی اس کے کمرہ میں داخل ہوئیں، ننھا سا لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا انہوں نے صبیحہ کی طرف اُسے بڑھاتے ہوئے کہا،

"ذرا دیکھنا تو یہ کیا ہے"،

صبیحہ نے ایک نظر ڈالی اور کہا،

"ڈاکٹر کا بل ہے!"

"کتنے کا"

"ستر روپے کا ہے!" ——— آپ نے روپے بھیج دیئے،

"نہیں!"

"اماں جی فوراً بھیج دیجئے!"

"لیکن سوال یہ ہے کہ گھر میں تو خدا کے فضل سے سب خیریت ہے کسی کے سر میں درد بھی سارے مہینہ نہیں ہوا، پھر کس کے علاج پر اتنا صرف ہو گیا؟"

"اماں جی وہ بیمار تھا نا، رحیمن کا شوہر شفقت میں نے ڈاکٹر سلطان کو چٹھی لکھ دی تھی کہ تن دہی سے اس کا علاج کریں، اور بل ہمارے پاس بھیج دیں، فوراً ادائیگی کر دی جائے گی!"

اس لئے کہ ان باتوں سے مجھے دُکھ ہوتا ہے ——————

کتنے شرم کا مقام ہے وہ غریب دن رات ہماری خدمت کرتی ہے اس پر کوئی وقت پڑے تو ہم یہ کہہ کر الگ ہو جائیں کہ تنخواہ تو ہم دے چکے، اب تم جانو اور تمہارا کام، اماں جی آپ کی نماز کبھی وقت کی قضا نہیں ہوتی، کیا آپ نہیں جانتیں یہ حرکت خدا کو خفا کر دے گی ؟"

"(غصہ سے) مت بکو صبیحہ"

"اماں جی، اگر میں بیمار پڑ جاتی، تو آپ ہزار روپے کا بل بھی اپنے آپ کو بیچ کر ادا کرتیں، لیکن جو ہستی سارا گھر چلا رہی ہے، اس کے لئے دل کی یہ تنگی ؛ اماں جی میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں، ایسی باتیں کیجئے گا، تو میں ——————

"نفرت کرنے لگو گی کیوں ؛ —————— بہر حال یہ بل ادا نہیں کیا جائے گا!"

رقیہ بیگم غصہ میں بھری ناپس چلی گئیں، صبیحہ نے بل اُٹھایا، کتابیں بغل میں دابیں اور منہ سے ایک لفظ کہے بغیر چپ چاپ کالج چلی گئی —————— ناشتہ تک نہیں کیا!

——————

"شفقت کے علاج کا بل ستّر روپے ———— ؟"

"ہاں امّاں جی تو کیا ہوُا ؟"

"یہ رقم کون ادا کرے گا ؟"

"آپ، ابا جی، ہیں، اور کون ادا کرے گا ؟ ———— کیا آپ کا ارادہ رحیمن کی تنخواہ سے رفتہ رفتہ وضع کرنے کا ہے ؟ ————

نہیں اماں جی یہ نہیں ہو سکتا، یہ ظلم ہے !"

"ظلم کی بچی، سوال یہ ہے کہ یہ رقم ہم کیوں ادا کریں ؟"

"پھر کون کرے ؟"

"وہ خود جس کا علاج ہوا ہے ؟"

"اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں، چاندی کی دو بالیاں تھیں، وہ بھی بک گئیں !"

"تو اس کی ذمہ دار ہم ہیں ؟"

"اور کون ہے اماں جی ———— صرف پندرہ روپے تو بیچاری کو تنخواہ کے ملتے ہیں، سوچیئے تو سہی، وہ کیسے اپنے شوہر کا علاج کر سکتی ہے -!

"تنخواہ دینے کے بعد ہمارا فرض ادا ہو جاتا ہے، اس میں اس کا پورا پڑتا ہے یا نہیں ؟ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں !"

اماں جی، ایسی باتیں نہ کیجیے ———— !"

"یہ حکم کیوں صادر فرمایا جا رہا ہے ؟"

"بھئی کیا کروں۔ لے تو ضرور آتا، لیکن آج وہ تمہاری چہیتی صاحبزادی ہیں نا صبیحہ بیگم!! انہوں نے ڈاکہ ڈال دیا میری جیب پر!"

یہ سن کر رقیہ کے کان کھڑے ہوئے،

"صبیحہ نے کہا کیا؟"

"میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ کھٹ کھٹ کرتی پہنچی، میں نے کہا بیٹی تم یہاں کہاں؟ کہنے لگی ابا جی مجھے زیادہ ضرورت نہیں ہے، ستر روپے فوراً چاہئیں، تھوڑی ہی دیر پہلے سیٹ کے لئے یہ رقم میں نے پیشگی کے طور پر لی تھی، حوالہ کر دی، کیا کرتا؟"

رقیہ نے جرح کی،

"لیکن صبیحہ کو کیا ضرورت پیش آگئی تھی اتنی بڑی رقم کی؟"

نعیم صاحب نے فرمایا۔

"بھئی کیا جانوں؟ اس نے مانگے میں نے دے دیئے؟ اس سے حساب پوچھتا کیا کرے گی؟ بہرحال میں اپنی لڑکی کو خوب جانتا ہوں، نہ اس رقم سے وہ جوا کھیلے گی، نہ شراب پیئے گی، کوئی ضروری ہی کام ہوگا!"

رقیہ خانم برس پڑیں،

"تم ہی نے غارت کیا ہے اسے ——— دیکھ لینا ایسی کالک لگائے گی منہ میں کہ روتے نہ بن پڑے گی، بھلا لڑکی ذات اور اتنی خودسر ——— ؟"

نعیم صاحب ان فضیح و بلیغ باتوں کے جواب میں کیا کہتے؟

(۷)

شام کو جب نعیم صاحب دفتر سے تشریف لائے، تو رقیہ خانم نے سب سے پہلا سوال یہ کیا،

"چائے کا سیٹ لائے؟"

انہوں نے سر کھجاتے ہوئے کہا،

"نہیں بھائی آج تو نہیں لاسکا!"

رقیہ کو غصہ آگیا،

"میں بھی اب لوہے کی پیالیوں میں سب کو چائے پلاؤں گی، ——— اتنے دن سے کہہ رہی ہوں، مگر روز آج کل ہو رہا ہے!"

نعیم صاحب نے اپنا آخری وار کیا، یعنی زور زور سے ہنسنے لگے پھر فرمایا۔

جو آج کالج جانے سے پہلے ہوئی تھی، پھر درد بھرے لہجہ میں کہا،

"یہ لچھن ہیں تمہاری بیٹی کے!"

نعیم کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا، اس نے کہا،

"صبیحہ نے وہ کام کیا ہے کہ میں تعریف نہیں کر سکتا، اب تک اپنی اکلوتی بچی کی حیثیت سے اسے چاہتا تھا، آج سے اس نے میرے دل میں اپنی عظمت بھی پیدا کر لی،!"

رقیہ خانم جل کر خاک ہو گئیں،

"اس نے عظمت پیدا کر لی، تمہارا سر فخر سے اُونچا ہو گیا، ایک ذلیل اور روسیاہ میں ہوں، نکال دو مجھے اس گھر سے!"

یہ کہہ کر وہ رونے پر آمادہ ہو گئیں، نعیم نے آنے والے طوفان کا اندازہ کر لیا تھا،

"بھئی وہ مجھ سے زیادہ تو تمہاری لڑکی ہے شرافت، انسانیت اور خدمتِ خلق کا یہ جذبہ اسے تمہاری ہی گود میں پروان چڑھ کر ملا ہے، میں باتیں کرنے کے سوا اور کیا کرتا ہوں؛ لہٰذا یہ خراجِ تحسین دراصل میں نے تمہاری خدمت میں پیش کیا ہے ——— گر قبول افتد زہے عز و شرف!"

اور پھر وہ ہنسنے لگے،

"معلوم ہوتا ہے آج چھوٹی رقیہ اور بڑی رقیہ میں کچھ جنگ زرگری ہو گئی ہے؟"

اس جملہ سے رقیہ نے ذرا بھی لطف نہیں لیا،

"میں کہتی ہوں ہوش کے ناخن لو، لڑکی کو ہاتھ سے بے ہاتھ نہ ہونے دو، کسی دن وہ کسی سے خود ہی طے کر کے شادی بھی کر لے گی، پھر دہائی دیتے رہنا خاندان کی اور ناک کی!"

نعیم نے پھر ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا،

"بہت خفا ہو بیچاری ہے —————— وہ بغیر میری مرضی کے کسی سے شادی نہیں کر سکتی، اگر یہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ اس کی مرضی پر عمل کروں گا، رہا خودسری کا الزام، تو یہ بالکل غلط ہے، اس جیسی سعید اور شریف لڑکی میرے اور تمہارے خاندان میں کوئی نہیں —————— لیکن بات کیا ہوئی، کچھ معلوم بھی تو ہو!"

رقیہ خانم کا دل بھر آیا،

"ایسی اولاد سے تو آدمی بے اولاد اچھا!"

نعیم نے بات سلجھانا چاہی،

"لیکن خدا کی بندی معموں میں کیوں باتیں کر رہی ہو؟ صاف صاف کہو نا کیا کیا اس نے؟"

رقیہ خانم نے رحیمن اور اس کے شوہر کی ساری سرگزشت ایک ہی سانس میں سنا ڈالی، پھر ڈاکٹر سلطان کے بل کا ذکر کیا، اس کے بعد وہ گفتگو دہرا دی

(۸)

بات جب بگڑتی ہے تو بگڑتی ہی چلی جاتی ہے !"

دو تین روز ماں بیٹی میں ذرا ان بن سی رہی، وہ کھنچی کھنچی رہیں، یہ چپ چپ،

ایک روز ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا، جو بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن گیا،

صبیحہ کالج جانے کے لئے بغل میں کتابیں داب کر نکلی، اور رقیہ کے کمرہ میں پہنچی،

"اماں جی آج کالج کی فیس دینا ہے ———— !"

کئی دن کے بعد اس نے ماں سے گفتگو کی تھی، لیکن جھجک اب تک قائم تھی، رقیہ نے کوئی جواب نہیں دیا، کنجی سامنے پھینک دی، صبیحہ نے کنجی اٹھائی صندوقچہ کھولا اور فیس کے روپے نکال لئے، ماں کو کنجی واپس کر کے وہ

جا رہی تھی کہ رحیمن ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی۔ اس لڑکی کی عمر گیارہ بارہ سال کی ہو گی، ناک نقشہ اچھا، آنکھوں میں ذہانت کی چمک چہرے پر بچپن کی معصومیت، صبیحہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی"

"رحیمن یہ کون ہے؟"

وہ حسرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی،

"میری بچی ہے، شفیقن ——————"

صبیحہ نے خوش ہو کر کہا،

"اچھا یہ تمہاری لڑکی ہے، بڑی اچھی ہے بھولی بھالی، گول مٹول ——

—— پڑھتی بھی ہے؟"

رحیمن نے ایک آہ سرد کے ساتھ جواب دیا۔

"داخل تو کرا دیا تھا اسکول میں، پاس بھی کر لیا تھا اس نے درجہ الیکن اب اٹھا لیا!"

صبیحہ نے حیرت سے رحیمن کی طرف دیکھا اور پوچھا،

"یہ کیا حماقت کی؟"

وہ حسرت بھرے لہجہ میں کہنے لگی،

"بیٹی پھر کیا کرتی؟ —————— فیس کہاں سے دوں؟ کتابیں کہاں سے خریدوں؟ کاپیاں کہاں سے لاؤں، قلم دوات، پنسل کا بندوبست کیسے ہو؟ پھر تو قرضدار بھی کافی ہو گئی ہوں، اس کے لئے اب تک یہ بیزی کھانا پکانا پڑتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لیتی آئی تھی کہ بی بی کہیں اپنے کنبہ میں

یہ سُن کر شفیقن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، رحیمن نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،

"اچھا ——————"

رقیہ نے کہا،

"تو کل لینے آنا، مجھے سکندر آپا سے ملنے جانا ہے، چھوڑتی آؤں گی!"

رحیمن نے ممنون آنکھوں سے بی بی جی کو دیکھا، اور شفیقن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کام پر ہاور چیخانہ چلی گئی —————— صبیحہ نے کالج کا رُخ کیا

نوکر رکھا دیں، دس روپے مہینہ بھی مل جائیں تو وہ قرضے میں دے دیا کروں گی پھر اس گھر کے کھانے کپڑے کا جو بوجھ ہے۔ اس سے نجات پا جاؤں!"

صبیحہ نے ایک رحم آمیز نظر شفیقن پر ڈالی،

"یہ کیا غضب کرتی ہو رحیمن! اس بیچاری کے یہ کھیلنے کھانے، پڑھنے لکھنے کے دن ہیں یا نوکری کرنے کے!"

رحیمن روہانسی ہو گئی

"بیٹی میری پھوٹی آنکھ کا یہی ایک دیدہ ہے، اس کا باپ یہی چاہتا تھا، اور میری بھی تمنا تھی کہ یہ دو حرف پڑھ لکھ جاتی، تو کسی اسکول میں استانی کرا دیتے، لیکن قسمت جب ساتھ نہ دے تو کیا کریں؟ فاقے کر کے تو نہ یہ پڑھ سکتی ہے، نہ ہم پڑھا سکتے ہیں۔ کوئی خوشی سے نوکر کرا رہی ہوں اسے! لیکن ——— جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا ہے۔!"

قبل اس کے کہ صبیحہ کچھ کہے، رقیہ خانم نے رحیمن کو مخاطب کیا،

"آپا سکندرہ کو ایک چھوکری کی ضرورت تھی، دس تو نہیں شاید آٹھ روپے مہینہ تک دے دیں گی!"

رحیمن آمادہ ہو گئی،

"آٹھ روپے سہی بی بی جی!"

بی بی جی نے فرمایا،

"وہیں دن رات اسے وہیں رہنا پڑے گا، تم کبھی کبھی جا کر دیکھ آیا کرنا!"

(۹)

دوسرے روز حسب وعدہ رحیمن اپنی لڑکی شفیقن کو لے کر آگئی، کل کے مقابلہ میں آج یہ زیادہ افسردہ اور اداس نظر آ رہی تھی، شاید اس کا ننھا سا دل حال اور مستقبل کی باتیں سوچ رہا تھا، شاید وہ سوچ رہی تھی، ماں سے جدا رہ کر سکندر کے ہاں کس طرح زندگی بسر کرے گی؛ خود رحیمن بھی مضمحل اور آشفتہ خاطر نظر آ رہی تھی، شاید وہ بھی اس فکر میں تھی کہ بیٹی ماں کے دامن سے جدا ہو کر سکھ اور چین کی زندگی بسر کر سکے گی یا نہیں؟

رقیہ خانم چارپائی پر بیٹھی کچھ کام کر رہی تھیں، پٹاری کھلی سامنے رکھی تھی، انہوں نے ایک نظر رحیمن اور اس کی لڑکی پر ڈالی، پھر اپنی مصروفیت برقرار رکھتے ہوئے پوچھا،

"آ گئی ——— ؟"

رحیمن نے شکوہ بھرے لہجہ میں کہا،

"جی بی بی جی!"

رقیہ خانم نے سوئی سے ٹانکا لگاتے ہوئے فرمایا،

"اچھا کیا!"

رحیمن اپنی لڑکی کو لے کر باورچی خانہ جا رہی تھی کہ راستہ ہی میں صبیحہ کا کمرہ پڑتا، وہ دروازہ میں کھڑی مل گئی، اس نے شفیقن کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا بیٹی کے ساتھ ماں بھی بڑھتی ہوئی چلی آئی، صبیحہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا

"لڑکی تمہارا کیا نام ہے؟"

اس انداز میں اسے کچھ بے اپنائیت کچھ بے تکلفی سی نظر آئی اس کا اداس چہرہ کچھ کھل سا گیا، اس نے ذرا شرماتے ہوئے کہا،

"شفیقن ——"

صبیحہ نے منہ بنا لیا،

"توبہ ہے —— تم اتنی اچھی اور سندر، تمہارا نام ایسا چھچھوندر!"

لڑکی ہنسنے لگی چھچھوندر بھلا وہ کیوں ہونے لگی، کہنے لگی،

"میں کیا کروں بی بی جی، اباں نے یہی رکھ دیا!"

صبیحہ نے اسے ٹوکا،

"میں بی بی جی نہیں ہوں، بی بی جی تو وہ ہیں جن سے تم ابھی مل کر آ رہی ہو، ——"

وہ حیرت سے دیکھنے لگی کہ اگر بی بی جی کی لڑکی بی بی جی نہیں تو اور

کیا ہے صبیحہ نے کہا،

"مجھے آپا کہا کرو!"

لڑکی کے چہرے پر رونق آگئی، اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن دل ہی دل میں اپنے بخت کی بلندی پر ناز کر رہی تھی، بھلا ایسی عالی مرتبت ہستی اس کی آپا ہو سکتی ہے!"

صبیحہ نے پوچھا،

"سمجھ گئیں نا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی، صبیحہ نے پوچھا،

"اب ہمیں کیا کہا کرو گی؟"

جی تو چاہا کہہ دے آپا، لیکن ہمت نہ پڑی، بڑے آدمی لاکھ بے تکلف ہو جائیں، لیکن ان سے گستاخی تو نہیں کی جا سکتی، وہ بے بسی کے ساتھ ماں کی طرف دیکھنے لگی، گویا پوچھ رہی تھی، بتاؤ اس ٹیڑھے سوال کا جواب کیا دوں؟ خود ماں بھی چکر میں تھی، کس طرح کہہ دیتی کہ ہاں تو آپا کہا کر، اپنی اور میری آقازادی کو؟

صبیحہ نے اس مرتبہ دونوں بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا اور کہا،

"تو سوچ کیا رہی ہے؟ بتاتی کیوں نہیں؟"

رحیمن نے ہمت بندھائی

"کہہ دے بیٹی!"

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا

"آپا ——— "

صبیحہ یہ لفظ سُن کر خوش ہو گئی اس نے کہا،

"شاباش، اسی طرح کہنا مان لیا کرو ——— ہاں بھئی بتاؤ، نام کیا ہے تمہارا؟"

وہ بول اٹھی،

"شفیقن!"

صبیحہ نے پھر ٹوکا،

"پھر وہی شفیقن ——— یہ تو نام ٹھیک نہیں ہے خراب بالکل خراب!"

رحیمن بول پڑی

"تو بٹیا تم ہی کوئی اچھا سا نام رکھ دو!"

صبیحہ مسکرانے لگی،

"ہم نے آج سے اس کا نام بدل دیا ——— اب یہ شفیقن نہیں پروین ہے!"

اتنا شاندار نام سن کر ماں بیٹی دونوں کی باچھیں کھل گئیں شفیقن نے مسکراتے ہوئے ماں کو دیکھا گویا کہہ رہی تھی، تم رحیمن کی رحیمن رہیں، ہم شفیقن سے پروین بن گئے، ماں نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا،

"نام تو اچھا ہے لیکن ——— "

"لیکن کیا؟"

"کہیں بیگم صاحب خفا نہ ہوں!"

"کچھ پاگل ہوئی ہو، نام بدلنے پر خفا ہو جائیں گی؟"

"کہیں گی ہمارا ایسا نام کیوں رکھ لیا، ہماری برابری کرتی ہے؟ —— —— نا بیٹی اس کا وہی پرانا نام ٹھیک ہے!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ اس کا نام بدل گیا، اب یہ پروین ہے، اماں جی کچھ نہیں کہیں گی، اور کہیں تو میرا نام لے دینا!"

ان الفاظ سے رحیمن کی کچھ ڈھارس بندھی، صبیحہ نے ایک مرتبہ پھر لڑکی سے دریافت کیا،

"بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ مسکرانے لگی، صبیحہ نے پھر پوچھا، ایک مرتبہ مسکرا کر اس نے ماں کی طرف دیکھا، پھر بولی:

"شفی —————— نہیں پروین —————— !"

صبیحہ، رحیمن اور پروین سب ہنس پڑے۔

(۱۰)

ہنسی کا شور جب ذرا کم ہوا تو صبیحہ نے رحیمن سے پوچھا،

"تو تم نے طے کر لیا ہے کہ سکندر خالہ کے ہاں پروین کو رکھا دو گی؟"

وہ کہنے لگی

"اور کیا کروں بیٹی؟"

صبیحہ نے کچھ سوچا اور بولی،

"سکندر خالہ کو جانتی بھی ہو کیسے مزاج کی ہیں؟"

"میں تو نہیں جانتی بیٹی!"

"بڑی تیز مزاج، اتنی غصّہ ور کہ سارا گھر کانپتا ہے ان سے، خالو ابا تک ان سے ڈرتے ہیں"،

رحیمن کے چہرے کا رنگ بدل گیا صبیحہ نے کہا،

"اور نوکروں کے ساتھ تو ان کا برتاؤ بے حد خراب ہے۔ گالیاں وہ

صبیحہ نے بتایا،

"سکندر خالہ کا ایک لڑکا ہے مسعود، اس پر دیں کا ہم عمر، بڑا شریر بڑا شیطان، بلکہ شیطان کے بھی کان کاٹتا ہے، در اصل سکندر خالہ اسی کی چاکری کے لئے رکھی ہوئی ہیں اور وہ مسعود جو ہے، اس وقت تک اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا، جب تک گھر کے نوکروں میں سے ہر ایک کو پیٹ نہ لے، کاٹ نہ کھائے، ایک مرتبہ میرے سامنے اس نے تو لن بوا سے کہانی سنانے کی چوتھی مرتبہ فرمائش کی، بیچاری بوڑھی عورت تین مرتبہ اپنے بوڑھے دماغ پر زور دے کر کہانی سنا چکی تھیں اب چپ ہو گئیں بس ان کا انکار کرنا تھا کہ مسعود نے لپک کر ان کے بازو میں جو اپنے دانت گڑ دیئے تو بیچاری بلبلا اٹھیں، پکارنا شروع کیا،

"ہائے میں مری، مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ!"

ہم لوگوں کی وجہ سے سکندر خالہ شرما گئیں، دوڑی دوڑی گئیں اور مسعود کو بڑی مشکل سے ہٹایا، اتنی دیر میں وہ لہو لہان ہو چکی تھیں، اس کا بس چلتا تو بوٹہ اتار کر دم لیتا، سامنے تو لن بوا کا نواسا کھیل رہا تھا، یہ ان کا عصائے پیری تھا، نظر کم آتا ہے، اسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے گھر سے سکندر خالہ کے ہاں آجاتی ہیں بس مسعود نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایسا کس کر اس بے خطا کی پیٹھ پر گھونسہ رسید کیا کہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا،

رحیمن کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی تھی، وہ اپنی چہیتی لڑکی کو کس طرح آدھ ردپے پر قربان کر سکتی تھی؟ اس نے لرزتی ہوئی

دیتی ہیں، مارتی وہ ہیں، حد یہ ہے کہ جرمانہ تک کرتی ہیں، آج تک کسی کو ان کے ہاں پوری تنخواہ نہیں ملی، کبھی آدھی، کبھی تہائی، کبھی چوتھائی جرمانہ میں ضرور کٹتی ہے —!"

رحیمن کا چہرہ زرد پڑ گیا، صبیحہ نے پوچھا،

"تنخواہ کیا دیں گی سکندر خالہ"؟

مری ہوئی آواز میں رحیمن نے کہا۔

"بی بی جی نے آٹھ روپے بتائے تھے!"

صبیحہ نے یہ سنکر کہا،

"اس کے معنی یہ ہوتے کہ چار پانچ روپے سے زیادہ نہیں ملیں گے — کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کبھی کبھار لڑکی سے کوئی نقصان نہ ہو جائے، ہر ٹوٹی ہوئی چیز کے دام بلیک مارکیٹ کے حساب سے لگاتی ہیں، اور ذرا مروت نہیں کرتیں، فوراً کاٹ لیتی ہیں!"

رحیمن کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا، وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے صبیحہ نے شاید طے کر لیا تھا کہ اس کے معلومات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر کے رہے گی، اس نے پوچھا،

"اور بھی کچھ معلوم ہے تمہیں؟"

رحیمن اتنا کچھ معلوم کر چکی تھی، اب کچھ اور معلوم کرنے کا حوصلہ باقی نہیں رہ گیا تھا، اس نے کہا،

"میں تو کچھ بھی نہیں جانتی!"

آواز میں کہا،

"وہ تو اللہ بھلا کرے گا میری بچی کو!"

صبیحہ نے تائید کی

"ہاں اور کیا ——— چار پانچ روپے مہینہ جرمانہ کٹنے کے بعد جو وہاں سے ملیں گے، وہ جلدی چونے پر صرف ہو جائیں گے۔

رحیمن نے فیصلہ کر لیا،

"بیٹی اچھا کیا، یہ باتیں بتا دیں!"

"تو کیا اب نہیں بھیجو گی؟"

"قیامت تک نہیں، بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان ——— میں باز آئی!" ایک ہی تو لڑکی ہے میری، خدا نہ کرے اسے کچھ ہو گیا، تو میں کیا کروں گی؟ میں تو کہیں کی نہ رہوں گی ——— بیٹی بی بی جی کو تم ہی طریقہ سے سمجھا دو کہ رحیمن اپنی لڑکی کو وہاں نہیں رکھائے گی۔"

---

(۱۱)

صبیحہ نے جواب دیا
"اچھا میں سمجھا دوں گی!"
"پھر ذرا دیر کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا،
"اگر تم چاہو تو میں پروین کے لئے بڑا اچھا بندوبست کر سکتی ہوں،
اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، رحمین کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا،
"تمہیں اختیار ہے بیٹی!"
صبیحہ کو جیسے کچھ یاد آ گیا، اس نے بتایا:
"پندرہ روپے مہینہ ملیں گے، کپڑے بھی بن جایا کریں گے۔ کھانا جھوٹن نہیں، بلکہ وہ جو سب کھائیں گے یعنی اچھے سے اچھا، خدانخواستہ اگر بیماری آزادی ہو تو ہر طرح کا علاج بھی مفت!"
یہ تو چھپّر پھاڑ کے دھن برسنے لگا تھا۔

"تو بیٹی مجھ سے کیا پوچھتی ہو، پہنچا دو ابھی!"

"ہاں میں ابھی اپنے ساتھ لیتی جاؤں گی!"

"ضرور لے جاؤ ——— لیکن بیٹی وہاں کام کیا کرنا پڑے گا اسے؟"

"کام؟ ——— (مسکرا کر) یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"یوں ہی ——— کہیں وہاں بھی تو کوئی مسعود بھیا نہیں ہیں؟"

صبیحہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، کہنے لگی،

"نہیں وہاں کوئی مسعود نہیں ہے، اور اگر ہو بھی تو وہ کچھ نہیں کر سکتا اور بہ فرض محال کسی طرح کی شرارت کرے تو اسے پوری سزا ملے گی،"

اس جواب سے رحیمن مطمئن ہو گئی، اور رحیمن سے زیادہ پردیس کا چہرہ بشاش ہو گیا، سکندر خالہ کے حالات اور مسعود کے کارنامے سن کر وہ دل ہی دل میں لرز رہی تھی، لیکن اب صبیحہ کی باتوں نے یہ دہشت دور کر دی، اس نے خود پوچھا،

"تو کب لے چلیں گی آپ مجھے؟"

صبیحہ نے اٹھتے ہوئے کہا،

"ابھی چلو ——— لیکن ہاں اگر رحیمن اگر اماں جی نے پوچھا تو کیا کہو گی؟"

یہ بڑا نازک سوال تھا، اس سوال کا برجستہ جواب بیچاری سے ممکن نہ

ہو سکا، اس نے مدد کی التجا صبیحہ ہی سے کی،

"بتاؤ کیا کہوں ؟"

"کہہ دینا اس کے سر میں درد ہو رہا تھا گھر بھیج دیا، پھر کسی دن دیکھا جائے گا!"

"اچھا بیٹی ——— یہ ٹھیک ہے، ابھی کہہ دوں گی!"

صبیحہ نے پہلے پروین کو باہر بھیج دیا پھر اپنی کتابیں لے کر وہ خود بھی باہر آئی، پروین منتظر کھڑی تھی، دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں، ذرا دیر کے بعد، ایک بس ملی، صبیحہ پروین کو ساتھ لے کر اس میں بیٹھ گئی، دو تین اسٹاپ کے بعد جب بس رکی تو صبیحہ اتری، پروین بھی ساتھ تھی، چند قدم چلنے کے بعد ایک کوٹھی سی نظر آئی، صدر دروازے پر ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا

"اپنا گھر"

یہ "اپنا گھر" چند باہمت خواتین کی مستعدی اور خلوص کا مظہر تھا۔ یہاں قوم کی مفلس اور نادار بچیوں کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ پیمانہ پر انتظام تھا، یہاں کی فضا کچھ ایسی تھی کہ قدم رکھتے ہی ایک نئی زندگی کا احساس ہونے لگتا تھا، چند مخیر اصحاب کے چندوں سے اس کا کام چلتا تھا، ایک مرتبہ کسی تقریب کے موقع پر نعیم بھی یہاں پہنچ گیا، اسے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا، کہ ایسا مفید ادارہ سرمایہ کی قلت کے باعث دشواریوں میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنے اخبار میں چند پُر زور مقالے لکھے، پھر ایک وفد کی تشکیل کی اور وزیر تعلیمات سے ملا، شہر کے دوسرے سربرآوردہ اہل

ممتاز اصحاب کی تائید حاصل کی، اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس ادارہ کی امداد کی جائے، بالآخر حکومت نے یہ مطالبہ منظور کر لیا اور ایک معقول رقم کی سالانہ گرانٹ مقرر کر دی،

صبیحہ کو شروع ہی سے خدمت خلق کا جنون تھا، اس نے باپ کے اخبار میں "اپنا گھر" کی جو تعریف پڑھی تو ایک روز کالج سے آتے ہوئے ادارہ کی منتظمہ فہمیدہ بیگم سے ملی، انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ نعیم صاحب کی لڑکی ہے، وہ بچھ بچھ گئیں، صبیحہ نے کہا، میں نے اس ادارہ کی بڑی تعریف سنی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کا ہاتھ بٹاؤں، فی الحال ایک گھنٹہ روز آنریری طور پر خدمت کرتی رہوں، انہوں نے سر آنکھوں پر یہ پیشکش قبول کر لی اور صبیحہ روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے وہاں جانے لگی، اس کی اس کارگذاری کا علم نہ نعیم صاحب کو تھا، نہ رقیہ کو، وہ اپنے کام کی نہ داد چاہتی تھی، نہ صلہ، پروین کو لے کر سیدھی "اپنا گھر" میں پہنچ گئی،!

(۱۲)

ہمیشہ کا معمول یہ تھا کہ سیدھی وہ کلاس میں جاتی، پڑھاتی، اور واپس چلی جاتی، کبھی کبھی دن فہمیدہ بیگم سے ملنے کا اتفاق نہ ہوتا، آج وہ سب سے پہلے انہی کے کمرہ میں گئی۔ انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا،

"آج کتنے دن کے بعد زیارت ہوئی ہے تمہاری!"

حبیبہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا،

"جی ہاں —— آتی تو روز ہوں، لیکن کالج کی جلدی ہوتی ہے اس لئے کلاس کے بعد فوراً چلا جانا پڑتا ہے —— آپ کو ایک زحمت دینی تھی!"

فہمیدہ بیگم نے آمادگی اور اشتیاق کے ساتھ کہا،

"زحمت کیسی، کہو کر تو دیکھو، تمہاری بات اور فہمیدہ نہ مانے تم تو فہمیدہ کی اور اس ادارہ کی محسن ہو الغنیم صاحب کے پہندر قلم سے

اس ڈوبتی ہوئی ناؤ کو ساحلِ مقصود تک پہنچا دیا ——— ہاں بیٹی
کیا بات ہے ؟"

صبیحہ نے پروین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"یہ ایک غریب اور ذہین لڑکی ہے، اس کی ماں اسے نوکر رکھانے
لائی تھی، مجھ سے اس کا مستقبل برباد ہوتے نہ دیکھا گیا، یہاں لے آئی ؛ اب
میری جرأتِ رندانہ کی لاج آپ کے ہاتھ ہے !"

فہمیدہ بیگم ہنسنے لگیں،

کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی، تم بھی ؛ ——— داخلہ
ہو جائے گا !"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"مکمل داخلہ ——— ؛"

فہمیدہ نے پوچھا

مکمل داخلہ کیسا ہوتا ہے ؟ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم !"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے بتایا،

"نہ یہ فیس دے سکے گی، نہ بورڈنگ کا کرایہ، نہ ڈائننگ ہال کی
رقم، نہ لباس کا خرچ، کتابیں، کاغذ، پنسل خریدنے کی سکت بھی اس غریب
ماں میں نہیں ہے !"

فہمیدہ بیگم کچھ دیر غوطہ میں رہیں، پھر بحرِ تخیل سے ایک گوہرِ آبدار
نکال لائیں۔

"کوئی پرواہ نہیں، میں اسے داخل کروں گی، سیٹھ قاسم بھائی نے بتیس بتیس روپے ماہوار کے چار وظیفے، غریب اور مستحق لڑکیوں کے لئے دیئے ہیں، یہ وظیفے میں ثانوی درجہ کی لڑکیوں کو دینا چاہتی تھی، لیکن تمہاری بات ٹال نہیں سکتی، ایک پروین کو مل جائے گا۔"

"تو کب داخل کریں گی آپ؟"

"ابھی اور کب؟"

پھر انہوں نے ضروری کاغذات کی خانہ پری کی اور داخلہ کر لیا، کہنے لگیں "چلو تمہارے سامنے اسے بورڈنگ میں پہنچا آؤں"

کوٹھی سے ملی ہوئی ایک اور کوٹھی تھی، جو بورڈنگ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی تھی، یہاں کچھ لڑکیاں ابتدائی درجوں کی، ورنہ زیادہ تر ثانوی درجوں کی رہتی تھیں، ایک کمرہ میں پروین کا بستر لگا دیا گیا، یہاں چار لڑکیوں کی گنجائش تھی، باقی تین سے اس کا تعارف کرا دیا گیا۔ پھر انہوں نے ڈائننگ ہال دکھایا، یہاں سب لڑکیاں ملکر کھانا کھاتی تھیں، پھر ہال میں لے گئیں، یہاں نماز پڑھی جاتی تھی، پھر وہ اسے کلاس روم میں لے گئیں اور بتا دیا یہاں پڑھو گی تم!

پروین دل میں حیران تھی کہ میں تو نوکری کرنے آئی تھی، یہاں تو میرے لئے ایسا ٹھاٹھ دار بندوبست کیا جا رہا ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی،

فہمیدہ ایک استانی سے کھڑی ہو کر باتیں کرنے لگیں، صبیحہ نے

پروین سے کہا،

"سنا تم نے؟ —— تم یہاں نوکری کرنے نہیں پڑھنے آئی ہو، خوب جی لگا کر پڑھنا، تاکہ ایک دن تم ان (فہمیدہ کی طرف اشارہ کرکے) کی جگہ یہاں کی منتظم بن جاؤ! —— کیوں ٹھیک ہے نا؟"

اس نے تائید میں گردن ہلا دی، صبیحہ اس ادا پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی، پھر اس نے کہا، "یہاں جی تو نہیں گھبرائے گا —— اپنی ہمجولیوں کے ساتھ خوب پڑھنا اور خوب کھیلنا!"

اس نے آہستہ سے کہا،

"بہت اچھا!"

صبیحہ نے اسے تسلی دی،

"اگر تمہارا کسی بات کو جی چاہے، یا کوئی تکلیف ہو تو میں روز آتی رہوں گی مجھ سے کہہ دینا، اس نے آمادگی کے ساتھ کہا،

"کہہ دوں گی!"

پھر اسے اس کے درجہ میں بٹھا کر صبیحہ اپنی کلاس میں چلی گئی،

---

(۱۳)

چار پانچ روز کے بعد ممتا کی ماری رحیمن صبیحہ کے پاس آئی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کھڑی ہوگئی۔ صبیحہ نے اسے دیکھا،

"کیا بات ہے رحیمن!"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی،

"بیٹی ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟"

صبیحہ نے جواب دیا،

"بالکل نہیں برا مانوں گی، کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

عاجزانہ طور پر وہ بولی،

"زندگی میں پہلی مرتبہ وہ مجھ سے جدا ہوئی ہے۔ آج کئی دن ہوگئے، وہ دکھائی نہیں دی، گھر جاتی ہوں تو وہ کاٹنے کو دوڑتا ہے، روٹی کھانے بیٹھتی ہوں تو اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے!"

یہ سُن کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی،

"تو کیا بیٹی کسی کو دے —— آئیں ——— ؟"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"ہاں ——— میں نے اُسے فروخت کر دیا، پھر اب کیا کر لو گی میرا؟ جاؤ پولیس میں رپورٹ کر دو، سپاہی آئیں اور ہتھکڑی ڈال کر لے جائیں مجھے۔"

رحیمن نے اس سے آگے کچھ نہ کہنے دیا۔

"بیٹا یہ نہ کہو، بے شک میں پڑین کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں، لیکن تم پر اسے بھی قربان کر سکتی ہوں، تمہارا روپ جب سے میں نے دیکھا ہے دل ہی دل میں نہ جانے ہر روز کتنی دفعہ سجدے کرتی ہوں،"

صبیحہ نے ٹوکا،

"ہائے رحیمن، یہ کفر کی باتیں نہ کرو ——— میں ابھی کالج جا رہی ہوں، میرے ساتھ چلو، ملا دوں گی،!"

وہ خوش ہو کر دعائیں دینے لگی،

"بیٹی سدا سکھی رہو!"

لیکن صبیحہ نے ایک شرط عائد کر دی،

"آج تو تمہیں لئے چلتی ہوں، لیکن وعدہ کرو آئندہ بار بار اس کے پاس نہیں جاؤ گی!"

اس وعدہ کے پہلوؤں پر غور کئے بغیر اس نے اقرار کر لیا،

صبیحہ نے توجہ سے اس کی باتیں سنیں، پھر کہا،

"وہ تو ہونا چاہیئے ایک ہی تو لڑکی ہے تمہاری!"

"ہاں بیٹی اور کیا!"

"تو آخر تم چاہتی کیا ہو!"

"کچھ نہیں، بس ایک نظر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی!" ———

بیٹی تم نے اُسے کہاں رکھا ہے!"

صبیحہ ہنس پڑی

"جیل خانہ میں ——— رحیمن وہ بہت آرام سے ہے،

بہت خوش ہے اگر تم بلاؤ گی وہ نہیں آئے گی!"

ایک ماں کی طرح رحیمن نے جواب میں کہا۔

میں اس کی خوشی نہیں چھینوں گی، میں اس کے سکھ میں کھنڈت نہیں

ڈالوں گی، میں اسے اپنے ساتھ لانے کی کوشش نہیں کروں گی، میں صرف

ایک نظر اپنی رانی کا چاند سا مکھڑا دیکھ لینا چاہتی ہوں!"

رحیمن کی ان باتوں سے صبیحہ بہت متاثر ہوئی، اس نے کہا،

"اگر میں یہ جانتی کہ تم اسے اتنا چاہتی ہو، تو تم سے جدا نہ کرتی۔

لیکن آج کی تکلیف کل کی راحت کا پیش خیمہ ہے، آج دکھ جھیلو گی تو کل

سکھ اٹھاؤ گی، آج کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر جدائی برداشت کر لو گی تو کل،

تم سے بڑھ کر خوش اور مسرور کوئی نہ ہو گا ——— رحیمن میں نے

اسے نوکر نہیں رکھا ہے۔ آ

"وعدہ کرتی ہوں بیٹی!"

صبیحہ نے سمجھایا،

اس میں تمہارا اور اس کا دونوں کا بھلا ہے، تمہیں بار بار دیکھ کر اس کی طبیعت اچاٹ ہو جائے گی، اس کا دل پورے طور پر وہاں لگ جائے، پھر روز ملو تو کوئی بات نہیں، ———— !

جبین نے ایک مرتبہ پھر اپنے وعدہ کی تجدید کی،

"بیٹی، ہفتہ میں ایک دفعہ سے زیادہ کبھی نہیں ملوں گی اس سے !"

صبیحہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی پھر اس نے کتابیں اٹھائیں اور کہا،

"چلو ————"

پھر کچھ یاد آ گیا، وہ کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی،

"تم جا کر بس اسٹاپ پر میرا انتظار کرو، میں ابھی پانچ منٹ میں آتی ہوں، ہم دونوں ساتھ جائیں گے تو ممکن ہے اماں جی پوچھ بیٹھیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!"

(۱۴)

صبیحہ ذرا دیر میں بس اسٹاپ پر پہنچ گئی، رحیمن اس کا انتظار کر رہی تھی، زیادہ دیر نہ ٹھہرنا پڑا تھا کہ بس آ گئی، صبیحہ "آؤ رحیمن" کہتی ہوئی بس پر چڑھ گئی، تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ "اپنا گھر" کے دروازے پر تھے،

صدر دروازے پر پہنچ کر صبیحہ نے رحیمن سے کہا،

"پروین یہاں رہتی ہے!"

یہ شاندار جگہ دیکھ کر رحیمن بہت خوش ہوئی،

ابھی مدرسہ کا وقت شروع ہونے میں کچھ دیر تھی، صبیحہ نے حمیدہ سے رحیمن کو ملایا، پھر اسے اس کوٹھی میں لے گئی، جو بورڈنگ کے طور پر استعمال ہوتی تھی کمرہ نمبر ۱۱ پروین کی اقامت گاہ تھا، وہاں پہنچی تو دیکھا پروین نہیں ہے، ایک لڑکی بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی، صبیحہ کو دیکھ کر سروقد تعظیم کے لئے کھڑی ہو گئی، صبیحہ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ

اور پوچھا،

"تمہاری ہمجولی اور ساتھی پروین کہاں گئی؟"

ہمجولی اور ساتھی کا لفظ سنکر رحیمن کے کان کھڑے ہوئے، لیکن وہ خاموش رہی لڑکی نے بتایا،

"ڈائننگ روم ناشتہ کرنے گئی ہیں!"

صبیحہ نے رحیمن سے کہا،

"آؤ تمہیں ذرا ڈائننگ روم کی سیر بھی کرا دیں، یہ صاف ستھرا کمرہ، یہ صاف ستھرا بستر دیکھ کر رحیمن کو یقین نہیں آیا کہ پروین یہیں رہتی ہے، پھر اس نے سوچا، ممکن ہے یہاں جھاڑو بہارو کا کام کرتی ہو، لیکن اس کے کانوں میں صبیحہ کے الفاظ گونجنے لگے، "تمہاری ہمجولی اور ساتھی"، کیا یہ لڑکی بھی ملازمہ ہے؟ نہیں یہ تو ملازمہ نہیں ہو سکتی، بھلا نوکرانیوں کا کہیں ایسا لباس ہوتا ہے؟ یا وہ کتابیں بیٹھ کر پڑھتی ہیں -

وہ صبیحہ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ ڈائننگ روم کیا بلا ہے، جہاں پروین ناشتہ کرنے گئی ہے؟ دل نے کہا، دماغ پر زیادہ زور دینے کی کیا ضرورت ہے؟ وہیں چل رہے ہیں، دیکھ لیں گے اس عجوبہ کو بھی جس کا نام ڈائننگ روم ہے -

اتنے میں صبیحہ اسے ایک وسیع اور کشادہ کمرہ میں لیکر پہنچی - فرش پر تپائیاں بچھی ہوئی تھیں، تپائیوں پر دودھ کی طرح سفید دسترخوان بچھا ہوا تھا، دسترخوان پر بڑے بڑے مگوں میں دلیہ رکھا تھا،

ہر لڑکی کے سامنے پیالیاں رکھی تھیں، جیسی لڑکیاں یہاں بھی ناشتہ کر رہی تھیں، ناشتہ وہ جو گھر میں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا، دلیہ، دودھ، چائے مکھن، ٹوسٹ، لڑکیاں مزے لے لے کر کھا رہی تھیں، چپتے چلتے صبیحہ ذرا کے ذرا ٹھٹکی، اس نے رحیمن سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"وہ دیکھو"!

رحیمن نے نظر اٹھا کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایک گوشہ میں پروین اپنی ہمجولیوں کے ساتھ صاف ستھرے لباس میں ملبوس بیٹھی ناشتہ کر رہی ہے، رحیمن نے محسوس کیا، چند ہی روز میں پروین کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑ رہا ہے، چہرے پر رونق آگئی ہے، گال پھول گئے ہیں آہستہ سے صبیحہ نے پوچھا۔

"دیکھا؛ دیکھ لیا ——————؟"

وہ بولی،

"ہاں بیٹی —————— لیکن یہ کیا ہے؟"

صبیحہ اسے اشارہ سے باہر لے آئی اور کہا،

"خاموش کھڑی رہو سب کچھ ابھی معلوم ہو جائے گا"،

تھوڑی دیر میں لڑکیاں ناشتہ کر کے باہر آگئیں ان میں پروین بھی تھی پروین نے صبیحہ کو دیکھا تو لپک کر آگے بڑھی، پھر اس کی نظر رحیمن پر پڑی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ارے اماں آپ؟"

پروین ہمیشہ رحیمن کو "تم" کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی، آج پہلی مرتبہ اس نے آپ کا لفظ استعمال کیا تھا!

یہ لفظ سنکر یہ تہذیب دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئی، اس نے کہا،

"ہاں میری بچی، جی نہ مانا تجھے دیکھنے آگئی!"

وہ کہنے لگی،

"اماں میں بہت اچھی طرح ہوں، آپا (صبیحہ) نے میرے لئے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ ہر طرح کا آرام مجھے میسر ہے، کسی طرح کی تکلیف نہیں، یہاں سب لوگ آپا کو بہت مانتے ہیں، ان کی وجہ سے ہر کوئی میرا بھی بہت خیال رکھتا ہے!"

صبیحہ نے کہا،

"پروین باتیں تو بہت ہو لیں، اپنی اماں کو ذرا اپنا کمرہ بھی تو دکھاؤ"

اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا،

"آیئے ————"

وہ رحیمن اور صبیحہ کو لے کر اس کمرہ میں پہنچی، جہاں سے یہ دونوں ابھی آئی تھیں، اس وقت کوئی اور لڑکی کمرہ میں نہیں تھی،

پروین نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"دیکھئے یہ رہا میرا بستر، ہر تیسرے دن اس کی چادر بدل دی جاتی ہے، یہ ہے میرا کمبل، یہ چادر ہے، یہ تکیہ! ———— کیوں اماں یہ چیزیں پسند ہیں آپ کو؟"

وہ خوشی کا جھولا جھولتی ہوئی بولی،

"ہاں بیٹی بہت زیادہ!"

پھر بدرین نے سرہانے کی الماری جو دیوار میں بنی تھی، کھولی، بہت سی کتابیں اور کاپیاں نکالیں اور رحیمن کے سامنے ڈھیر کر دیں،

"دیکھئے اماں یہ میری کتابیں ہیں، ناشتہ کے بعد ہم لوگ پڑھنے چلے جاتے ہیں، پھر ایک بجے چھٹی ہوتی ہے، کھانا کھا کر ذرا دیر سو رہتے ہیں، اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھ کر پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں، عصر تک پڑھتے ہیں، عصر کی نماز پڑھ کر کھیلتے ہیں، جس کا جو جی چاہے کھیلے، مغرب کے بعد کھانا کھا کر پھر پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں، عشا تک پڑھتے ہیں، عشا کی نماز پڑھ کر سو جاتے ہیں!"

رحیمن منہ کھولے یہ داستانِ حیرت بیان سن رہی تھی، اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا، آخر وہ خاموش نہ رہ سکی، اس نے پوچھا،

"تو کیا یہاں تم پڑھتی ہے؟"

وہ ہنسنے لگی،

"اور کیا کرتی ہوں؟ —————— آپا سے پوچھ لیجئے!"

رحیمن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے، وہ فخر کے ساتھ اپنی بیٹی کو دیکھنے لگی، بیٹی نے اسے خوش خبری سنائی،

"پڑھ لکھ کر میں استانی بنوں گی!"

پھر اس نے صبیحہ سے اپنے دعوے کی تصدیق چاہی،

کر اس نے پوچھا،

"کیوں بیٹی ہر لڑکی کے مصارف کتنے ہوتے ہیں؟"

صبیحہ نے جواب دیا،

"تیس روپے ماہوار!"

رحیمن نے بے کل ہو کر پوچھا،

"لیکن پروینا ——————"

صبیحہ نے اُسے ڈھارس دی،

"پروین کے مصارف کا بندوبست اللہ میاں نے اپنے ذمہ لے لیا ہے، تم فکر نہ کرو!"

رحیمن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ باچشمِ اشک بار آسمان کی طرف دیکھنے لگی، گویا وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

"کیوں آپا جی؟"

اُس نے تائید کی،

"ہاں بھی ہاں"

اتنے میں اسکول کی گھنٹی بج گئی، جلدی جلدی پروین نے بستہ سنبھالا

الماری بند کی، بستر پر، پلنگ پوش ڈالا اور کہا،

"اماں اب، میں جاتی ہوں، ورنہ دیر ہو جائے گی!"

رحیمن پروین کی اس مستعدی سے بہت خوش ہوئی،

صبیحہ نے کہا،

"لیکن اپنی اماں کو ذرا اپنا مدرسہ بھی تو دکھادو!"

وہ خوشی خوشی آمادہ ہو گئی،

"ہاں ضرور —————— آیئے چلیئے!"

وہ صبیحہ اور رحیمن کو لے کر اپنے کلاس روم کی طرف گئی، ابھی کلاس شروع نہیں ہوا تھا، دوسری سب لڑکیاں پہنچ چکی تھیں، سب نے پروین کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اتنے میں استانی صاحبہ آگئیں، سبق شروع ہو گیا، سب سے پہلے پروین کی باری آئی، اس نے فر فر اپنا انگریزی سبق سنا دیا، استانی نے اُسے شاباش دی، پھر دوسری لڑکی کا سبق سننے لگی،

صبیحہ نے رحیمن سے کہا،

"آؤ اب چلیں!"

رحیمن پھر صبیحہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگی "اپنا گھر" کے احاطہ سے باہر نکل

زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ

جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

(۱)

"قومی کالج" شہر کا مایہ ناز تعلیمی ادارہ تھا، یہ سرکاری ادارہ نہ تھا، قوم کے چند دردمند مخلص، اور ایثار پیشہ لوگوں نے ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر اُسے قائم کیا تھا، یہ لوگ ایم اے تھے پی، ایچ ڈی تھے، لندن پیرس اور برلن کی دانش گاہوں کی ان کے پاس اعلیٰ ترین ڈگریاں تھیں، یہ انگریزی تحریر و تقریر پر وہی قدرت رکھتے تھے جو ایک اہل زبان کو ہو سکتی ہے، فلسفہ جدید پر اُن کی نظر اتنی وسیع تھی کہ ان کی تصنیفات اور مقالات کی غیر ممالک تک میں دھوم تھی، سیاست اور اقتصادیات کے فن میں بھی انہیں غیر معمولی دسترس تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اپنے وطن سے محبت تھی، وطن سے زیادہ ملت سے، اور ملت سے زیادہ دین سے یہ اپنا وجود وطن پر قربان کر سکتے تھے، وطن کو ملت پر نثار کر سکتے تھے اور ملت کو دین کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے،

یہ اگر چاہتے تو بہتر سے بہتر سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے تھے، ملک کی مایہ ناز تعلیمی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کی طرف سے گراں قدر مشاہرہ کی برابر پیش کش ہوتی رہتی تھی، لیکن ان کا جواب ایک تبسم کے سوا کچھ نہ تھا،

انہیں نہ اپنے مستقبل کی فکر تھی، نہ حال کی، نہ انہیں زر و مال کی ہوس تھی، نہ شہرت کی، نہ یہ واہ واہ کے خوگر تھے، نہ نکتہ چینیوں سے بد دل، ان کی قیمت نہ خراج تحسین تھا، نہ پرشور نعرے، یہ نہ تیر ملامت سے خوفزدہ تھے نہ شمشیر تنقید سے،

یہ جانتے تھے، ہماری قوم درماندہ اور پس ماندہ ہے، ہماری قوم کے لوگ سربلندی کے، ناموری کے، دولت و ثروت کے جویا ہیں، شہرت سے بے نیاز ہو کر دولت سے بے پروا ہو کر فقر و فاقہ کے عالم میں زندگی بسر کر کے اپنی دھن میں لگا رہنا، اپنا کام کئے جانا، یہ نہیں جانتے ضرورت ہے، کہ ان کے سامنے بے غرض خدمت کا نمونہ پیش کیا جائے، اگر یہ نہیں متاثر ہوتے تو وہ نسلیں جو اس درسگاہ میں پروان چڑھیں گی، یہاں آنکھیں کھولیں گی اور تربیت حاصل کریں گی، خدمت قوم و ملت کا جذبہ لے کر میدان عمل میں اتریں گی، انسانیت کے صحیح معیار کی حامل ہوں گی۔

یہی سوچ کر انہوں نے یہ درس گاہ قائم کی تھی، اس کے پرنسپل ڈاکٹر تھاکر تھے، علی گڑھ کے ایم اے، برلن یونیورسٹی کے پی، ایچ ڈی، اردو زبان کے مایۂ ناز خطیب، انگریزی کے مانے ہوئے انشا پرداز، فلسفہ کے

پروفیسر ڈاکٹر ماجد حسین تھے الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے، اور ہائڈبرگ یونیورسٹی (جرمنی) کے پی ایچ ڈی، انگلش لٹریچر کے پروفیسر، ڈاکٹر حبیب تھے پیدا لکھنؤ کے ایک شریف گھرانے میں ہوئے، لیکن ابتدائی سے لے کر انتہائی تعلیم تک انہوں نے لندن میں حاصل کی، دولت مند باپ کے بیٹے تھے ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کو موجود تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کیا، پھر جرمنی چلے گئے، پانچ سال وہاں رہے، اور مختلف علوم و فنون کی تکمیل کرتے رہے۔

ان تینوں نے مل کر طے کیا کہ ہم سرکاری ملازمت نہیں کریں گے، ہم سربلندی اور شہرت کا پیچھا نہیں کریں گے۔ ہم مال و دولت کی ہوس نہیں کریں گے، ایثار و قناعت کی زندگی بسر کریں گے، بے لوث اور بے غرض طور پر قومی خدمت کریں گے، ہم میں سے کوئی بھی سو روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہیں لے گا۔ ہماری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کے نونہالوں کی تربیت کریں، انہیں سیدھے راستہ پر لگائیں، انہیں بتائیں کہ

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

ان میں اسلام کی محبت کا جذبہ پیدا کریں انہیں قوم پر مرمٹنا سکھائیں، ان میں ایثار اور خدمت کا ولولہ پیدا کریں،

یہ کام بغیر نمونہ کے نہیں ہو سکتا، صرف تحریر اور تقریر سے کام نہیں چل سکتا، اگر واقعی ہم یہ چاہتے ہیں کہ قوم کی حالت میں انقلاب آئے، قوم کے بگڑے ہوئے حالات سدھریں تو پھر ہمیں

کلرک بن سکیں، نہ سپیریر سروس کے امتحان میں بیٹھ سکیں، نہ سرکاری ملازمت حاصل کر سکیں، وہاں اپنے لڑکوں کو بھیجنا اور ایسے کالج کی مالی امداد کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

لیکن ڈاکٹر شاکر کا عزم بلند ان دشواریوں کو خاطر میں بھی نہیں لایا وہ صاف صاف کہتے تھے اکلرکی اور سرکاری ملازمت کے لیے بہت سے کالج موجود ہیں، یہ یونیورسٹیاں اس فریضہ کے سوا اور کون سا فریضہ انجام دیتی ہیں، اتنے بڑے ملک میں، اتنی بڑی آبادی رکھنے والی قوم میں ایک درسگاہ بھی، ایسی ہونی چاہیئے، جہاں علم صرف علم کے لیئے پڑھایا جائے؛ جہاں کے طلبہ سرکاری ملازمت، ذاتی سربلندی اور مالی عروج و ترقی سے بے نیاز ہوں، ان کے دل میں ملازمت کا خیال ہی نہ ہو، یہ صرف اس لئے پڑھیں کہ علم کی شمع روشن رکھیں گے، یہ صرف اس لئے میدان عمل میں اتر کر ابنائے جنس کی خدمت کریں گے، اگر کروڑوں کی تعداد رکھنے والی قوم ایسا ایک ادارہ بھی نہیں قائم کر سکتی، تو یہ اس کے لئے باعث شرم ہے۔ اور میں یہ داغ اپنی قوم کے دامن سے دھو دینا چاہتا ہوں،

جہاں تک تعلیم کا تعلق تھا، گو کالج کے پاس شاندار عمارت تھی نہ قیمتی کوٹھی، لیکن چراغ سے چراغ جلتا ہے، علم کے ان چلتے پھرتے مجسموں نے کس مپرسی اور مالی پریشانیوں کے باوجود، ایسا اونچا معیار تعلیم کا قائم کر دیا تھا دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری کالج، قومی کالج پر رشک کرتے تھے، بے شک قومی کالج کو ملک کی کسی یونیورسٹی نے تسلیم

اس مقصدِ عظیم پر اپنے مستقبل کو، اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو، اپنی سربلندی اور سرفرازی کے خیال کو، مال و دولت کی محبت کو قربان کر دینا پڑیگا، اور واقعی اپنے عمل سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ جو کچھ ان کے دل میں تھا، وہ آپ انہوں نے کہا، جو کچھ انہوں نے کہا، وہی ان کے دل میں بھی تھا، ان کے قول و عمل میں کوئی تفاوت نہ تھا،

کسی ڈھانچہ کا کھڑا کر لینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن اسے سنوارنا تشکیل پذیر کرنا، اس میں جان ڈالنا بڑا کٹھن ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شاکر، اور ان کے جواں ہمت رفقاء نے یہ کار دشوار انجام دے ڈالا تھا۔

قومی کالج قائم تو ہو گیا، لیکن نہ اس کے پاس سرمایہ تھا نہ حکومت کی اعانت، نہ سرمایہ داروں اور دولت مندوں کی پشت پناہی، اخلاص اور ایثار کے سوا یہاں کے خزانہ میں کچھ تھا ہی نہیں،

مزید ستم یہ کہ، اس کالج کو حکومت نے اب تک تسلیم نہیں کیا تھا، وہ ایسے کالج کو کیسی طرح تسلیم کر لیتی، جہاں نہ تنخواہوں کا گریڈ تھا، نہ ترقی نہ پراویڈنٹ فنڈ، نہ میز نہ کرسی، نہ عمارت نہ فرنیچر، جہاں کا پرنسپل سو روپے ماہوار تنخواہ لیتا تھا، جہاں کے پروفیسر سو سے بھی کم گزارہ کر لیتے تھے، حکومت کی نظر میں یہ کالج ایک مذاق تھا اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس مذاق کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھی،

ملک کے تعلیم یافتہ اور دولت مند طبقہ کی طرف سے بھی سرد مہری کے ساتھ اس کی پذیرائی ہوتی، جہاں سے فارغ ہونے کے بعد لڑکے نہ

نہیں کیا، محکمہ تعلیمات کے کاغذات پر اس کا کوئی وجود نہیں تھا، حکومت کے ایوان خسروی میں ان بوریہ نشینوں کے اس مکتب کا مذاق اڑایا جاتا تھا، لیکن یہاں کے تعلیم یافتہ غیر ممالک کی یونیورسٹیوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے، اور وہ اپنی علمی دھاک اور ساکھ اس طرح قائم کرتے تھے کہ دوسرے عش عش کر کے رہ جاتے تھے، ملک کی کوئی یونیورسٹی انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی، لیکن غیر ملکی یونیورسٹیاں شوق سے اپنے ہاں ان کا داخلہ کرتی تھیں اور اپنے ہاں کی بڑی سے بڑی ڈگری ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر اور امتحان میں ہر طرح انہیں اہل پا کر عطا کر دیتی تھیں۔

قومی کالج کی حالت یہ تھی کہ جو حقیر تنخواہ پرنسپل صاحب اور دوسرے پروفیسروں کی مقرر تھی وہ بھی باقاعدگی کے ساتھ کسی معین تاریخ پر نہیں ملتی تھی، یہ نشو اور اسی ۸۰ روپے بھی دس دس اور پانچ پانچ کر کے ملتے تھے اور پھر بھی ہر مہینہ کچھ نہ کچھ رقم باقی ہی رہ جاتی تھی، اور اس طرح رفتہ رفتہ سال میں دو تین ماہ کی تنخواہ بقایا بھی رہ جاتی تھی، اس صورت حالات کے باعث کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پرنسپل صاحب یا کسی اور پروفیسر کے ہاں کھانا ہی نہ پکتا، لیکن مجال ہے کہ ماتھے پر شکن آ جائے یا بددلی کے آثار پیدا ہو جائیں یا فرض کی ادائی میں کسی قسم کی سستی ہو جاتے،

ڈاکٹر شاکر کچھ ایسے درویش منش، فرشتہ صفت اور سراپا سحر و اعجاز شخصیت کے مالک تھے کہ لوگ ان سے لڑنے کے لئے جاتے تھے مگر سامنے پہنچ کر سر جھکا کر بیٹھ جاتے تھے، اپنی شکائتیں لے کر پہنچتے

تھے۔ مگر ان کا حالِ زار دیکھ کر دفترِ شکایت جیب سے باہر نہ نکلتا، فقر و فاقہ کی فریاد لے کر پہنچتے تھے، لیکن ان کا روزہ دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتے تھے۔

قومی کالج میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہ تھی، لیکن جو تھے وہ ایک خاص مقصد کے حامل، ان کے سامنے ایک منزل تھی، ایک نصب العین تھا، اور ڈاکٹر شاکر کی سحر طراز شخصیت نے ان میں اُس مقصد کے حاصل کرنے اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک جنون پیدا کر دیا تھا،

جب کبھی اپنے طلبہ کے مجمع میں ڈاکٹر شاکر پہنچ جاتے تو ایسا معلوم ہوتا، جیسے چیلوں کے سامنے گرو پہنچ گیا، جیسے مردانِ باصفا کے حلقہ میں مرشد کامل آ گیا، وہ ویسے بھی دیدہ زیب و دلفریب تھے، ان کی روحانی ریاضت، اخلاقی پابندی اور ذاتی سادگی نے انہیں اور زیادہ محبوب بنا دیا تھا، وہ ایک آئیڈیا بن گئے تھے، ایک نشان بن گئے تھے عظمت کا، انسانیت کے معیار کا،!

ڈاکٹر شاکر کا دلنواز تبسم ایک نئی زندگی پیدا کر دیتا، طلبہ کے دل میں ان کی دل میں اتر جانے والی باتیں ایک نئی زندگی عطا کر دیتیں وہ غصہ کرنا تو جانتے ہی نہیں تھے، شفقت، عنایت، احسان اور مروت

یہ تھے ڈاکٹر شاکر کی عہد آفریں شخصیت کے اجزاء،

رفتہ رفتہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے جو قومی کالج کی افادیت

(۲)

جس طرح اولاد باپ کے کردار و سیرت، ذات اور شخصیت سے متاثر ہوتی ہے، اسی طرح شاگرد استاد کی ذات اور شخصیت کردار و سیرت سے متاثر ہوتے ہیں، کچھ شعوری طور پر، کچھ غیر شعوری طور پر،

دوسرے کالجوں کے لڑکے اوقاتِ درس کے علاوہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ کھیل کود، ہنسی مذاق، سیر تفریح، سیر گشت اور آوارہ گردی میں صرف کرتے تھے، اساتذہ ان سے نالاں، ساتھی ان سے عاجز، دوست ان سے بیزار، دشمن ان سے متنفر، کھیل کے میدان میں ان کا کوئی اصول نہیں کلاس روم میں یہ کسی ضابطہ اور قاعدہ کے پابند نہیں، اساتذہ سے چھیڑ چھاڑ ان کا شعار، ہم جماعت طلبہ اور طالبات سے پھکڑ پن ان کی عادت بعض وقت تو ان کا مذاق اتنی مبتذل اور گھناؤنی صورت اختیار کر لیتا تھا کہ شرم آنے لگتی تھی،

سے متاثر ہو کر نہیں ڈاکٹر شاکر کی باعظمت شخصیت متاثر ہو کر کالج کی مالی امداد کرنے لگے، درحقیقت یہ انھی لوگوں کا چندہ تھا، جو دس دس پانچ پانچ روپے کی صورت میں اساتذہ کی جیب میں تنخواہ کے نام پر کبھی کبھی پہنچ جاتا تھا۔

لیکن ڈاکٹر شاکر اور ان کے رفقاء کی سحر طراز شخصیت کا یہ کرشمہ تھا کہ قومی کالج کی فضا دوسرے کالجوں سے یکسر مختلف تھی،
مذاق یہاں کے طلبا بھی کرتے تھے، لیکن شائستگی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے یہاں کے لڑکے بھی عاری نہ تھے، لیکن تہذیب کے ساتھ، سالگرہوں، اور ہم جماعتوں سے گلچھرے یہاں کے طلبہ بھی کرتے تھے، لیکن سلیقہ کے ساتھ ان کے سینہ میں بھی دل تھا اور اس دل میں امنگیں اور آرزوئیں بھی تھیں، انہوں نے بھی اسی دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں، اور اس دنیا سے یہ بے پروا اور الگ نہیں رہ سکتے تھے، یہ بھی آنکھ رکھتے تھے، کان رکھتے تھے، دماغ رکھتے تھے اور دل رکھتے تھے، لیکن ان کی آنکھ بدنظری کی مجرم نہیں تھی، ان کا دماغ خیالات فاسد کی آماجگاہ نہیں تھا، ان کے کان فحش باتیں سننے کے لئے نہیں تھے، ان کا دل ناپاک نہیں تھا،

پڑھنے کے وقت یہ خوب پڑھتے تھے، کھیلنے کے وقت یہ خوب تفریح کرتے تھے، لیکن کیا مجال ہے کہ ان کے کسی عمل، کسی بات، کسی رویہ سے چھچھورا پن ظاہر ہوتا ہو، ہر بات میں وقار، ہر کام میں شائستگی، ہر موقع پر ادب اور تہذیب کا مظاہرہ،

دوسرے کالجوں کے طلبہ معلومات عامہ سے بالکل بے خبر تھے درسی مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین میں بالکل کورے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو ڈی کیو کو اسپین کا تاراالحکومت بے تکلف بنا دیتے تھے جن کے نزدیک عالمگیر اکبر کا دادا تھا،

لیکن قومی کالج کے طلبہ اس بات میں بھی منفرد اور یگانہ تھے، ا
درسی مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین کا بھی یہ مطالعہ کرتے رہتے تھے، لائبریری ان کا مستقل مرکز تھا، اردو انگریزی، فارسی کی کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتیں، اس شوق علم اور کثرت مطالعہ نے ان کے معلومات میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا، ہر موضوع پر یہ بول سکتے تھے، ہر موضوع سے متعلق ان کے نہاں خانۂ دماغ میں معلومات کا خزانہ بھرا پڑا تھا، یہ ابھی کسی مضمون میں ماہر نہیں ہوتے تھے، لیکن کسی مضمون میں کورے ہوں ایسا بھی نہیں تھا ———

اس فرق کا نتیجہ یہ تھا، جب کبھی انٹر کالج، یا انٹر یونیورسٹی میں قومی کالج کے طلبہ شریک ہوتے تو سب سے بازی لے جاتے، عموماً ٹرافی انہی کے حصہ میں آتی،

ایسے موقعوں پر عام طور پر کامیاب اور ناکام ہر قسم کے طالب علم جوش میں بھر جاتے ہیں، اگر کامیاب ہوں گے تو اپنے کامران ساتھی کو سر پر بٹھا لیں گے، شور مسرت سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے گی اور ناکامی کی صورت میں غم و غصہ چھپائے نہیں چھپے گا، کامیاب فریق نے اگر زیادہ جوش کے ساتھ مسرت کا اظہار کیا تو یہ فوجداری پر اتر آئیں گے، فتنہ و فساد شروع کر دیں گے، لیکن قومی کالج کے طلبہ اس باب میں بھی یگانہ اور منفرد تھے، ناکامی سے انہیں کبھی سابقہ نہیں پڑا، کامیابی کے جوش میں یہ کبھی حد اعتدال سے باہر نہیں گئے، ناکام حریف کا مذاق اڑانے کے بجائے دل ہی دل میں ہنسا کیے

(۳)

ہارڈنگ کالج نے ملک گیر پیمانہ پر ایک ڈبیٹ کا انتظام کیا، اس میں شرکت کے لئے ملک کے تمام کالجوں کو دعوت نامے بھیجے گئے، ہر کالج سے دو دو مقرر طلب کئے گئے تھے، قومی کالج کے نام بھی دعوت نامہ آیا تو نوٹس بورڈ پر اعلان کر دیا گیا کہ فلاں تاریخ کو امتحان مقابلہ ہوگا، جو طلبہ اس مباحثہ میں حصّہ لینا چاہیں وہ اپنے موضوع پر تیاری کر کے ٹھیک سات بجے شام کو ہال میں پہنچ جائیں، ایک کمیٹی مقررین کی تقریریں سنے گی، جو دو طلبہ بہتر ثابت ہوں گے، انہی کو ہارڈنگ کالج ڈبیٹ میں حصّہ لینے کے لئے نامزد کر دیا جائے گا،

دوسرے کالجوں کی طرح قومی کالج میں بھی زور شور سے امتحان مقابلہ کی تیاریاں شروع ہو گئیں،

کالج کے مانے ہوئے مقررین میں صفدر، سجاد، انور اور شوکت تھے،

اس طرح اس سے ملیں گے جیسے یہ ہارے ہیں وہ جیتا ہے۔

ان باتوں کا اثر یہ پڑا کہ گو سرکاری حیثیت سے قومی کالج کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، لیکن ممکن نہ تھا کہ ملک میں کوئی انٹر یونیورسٹی یا انٹر کالج تقریب ہو اور اس میں قومی کالج کی ٹیم مدعو نہ ہو۔ جب یہ ٹیم پہنچتی تو ہاتھوں ہاتھ لی جاتی، حریف طلبہ تک اس کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کر دیتے،

دیں، ایسا شرمندہ ہوا کہ پھر نہ ٹھہر سکا، ڈاکٹر شاکر نے جو صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے، اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تقریر جاری رکھنے کی فرمائش کی، لیکن تالیوں کے شور نے اُسے حواس باختہ کر دیا تھا، پھر وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا، ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا،

پھر بہادر صاحب اسٹیج پر نمایاں ہوئے، یہ انور کا حشر دیکھ کر حواس کھو چکے تھے، اسٹیج پر آئے تو بڑے حوصلہ کے ساتھ، لیکن یہ سوچ کر دم گھٹنے لگا، کہ اگر انور کی طرح خیر مقدم کیا گیا تو کیا ہوگا؛ اس وہم نے دہشت کی صورت اختیار کر لی، بیچارے کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا، جیسے دھلا ہوا کپڑا، اس کا ارادہ بھی تقریر کا آغاز شعر ہی سے کرنے کا تھا، لیکن انور کے انجام نے اسے یہ ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا، پھر اب تقریر کس طرح شروع کی جائے، اسٹیج پر آکر وہ بھی سوچنے لگا،

دو منٹ گذر گئے،

ایک طرف سے آواز آئی،

"کیا بھول گئے؟"

دوسری طرف سے کسی نے کہا

"یاد کر رہے ہیں۔"

ایک اور آواز آئی،

"حافظہ کمزور ہے!"

ایک اور نعرہ،

یونین کے اسٹیج پر جب یہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو مخالف طلبہ بھی محویت کے ساتھ سنتے رہتے، کیا مجال جو کسی طرف سے مداخلت یا ہوٹنگ ہو جائے عام خیال یہی تھا کہ مذکورہ چار طلبہ میں سے کوئی دو اہارڈنگ کالج کے مباحثہ میں حصہ لینے کے لئے منتخب ہوں گے۔

آخر وہ دن آیا، اسٹیج کے سامنے کمیٹی کے ممبران جو کالج کے اساتذہ ہی تھے اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے ڈائس پر، مقابلہ میں حصہ لینے والے طلبہ اور ان کے حمایتی بیٹھ گئے، عام کرسیوں پر مقابلہ میں حصہ نہ لینے والے طلبہ بیٹھ گئے، لڑکیوں کی کرسیاں آگے تھیں، لڑکوں کے پیچھے بعض دوسرے کالجوں کی طرح یہاں بھی مخلوط تعلیم جاری تھی، لیکن جو مفاسد ایسی مخلوط تعلیم گاہوں میں عام ہیں، ان کا قومی کالج میں کہیں دور و نزدیک پتہ بھی نہیں تھا،

سب سے پہلے شوکت کا نام پکارا گیا!

وہ ایک فاتح کی شان سے اسٹیج پر نمودار ہوا، اس نے تقریر شروع کی خیالات سلجھے ہوئے، زبان اثر انگیز لب و لہجہ خطیبانہ، کہیں پرجوش، کہیں نرم، حرکات وسکنات ایک کامیاب مقرر کی طرح، الفاظ اور جذبات کے تابع ———

وہ تقریر کرکے جب اپنی جگہ پر بیٹھا، تو بڑی دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

پھر انور کی باری آئی، اس نے تقریر کا آغاز ایک شعر سے کیا، لیکن دوسرا مصرعہ بھول گیا، دماغ پر زور دینے کے لئے رکا تو مجمع نے تالیاں پیٹ

"یہاں کچھ نازک دماغ لوگ بھی ہیں آہستہ آہستہ بولتے رہیئے!"

کسی نے مصرع پڑھا"

"سرہانے میر کے آہستہ بولو"

دوسرے نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا

"ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے"

اور پھر ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

لیکن، صفدر، ان باتوں سے ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا، اس نے اپنی تقریر جاری رکھی،

اور چند ہی لمحوں میں وہ اس طرح بولنے لگا، جیسے کچھار میں شیر دھاڑ رہا ہو۔۔

سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا، مذاق اڑانے پر جو لوگ کمربستہ تھے، وہ دم بخود، یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک کشور کشا اپنے مفتوحوں کے سامنے محو تکلم ہے الفاظ اس طرح اس کے منہ سے نکل رہے تھے جیسے آبشار سے موتی، کے مانند قطرہ ہائے آب کی لڑیاں نکلتی ہیں، زور اور جوش ایسا معلوم ہوتا تھا یہ سارا مجمع اس کی انگلیوں پر ناچ رہا ہے اتاریخی مثالیں ایسی، جو ولولہ انگیز بھی اور روح پرور بھی،

صفدر جب تقریر کر چکا۔ تو کئی منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

صفدر کامیابی کے نشہ میں چور، تبسم، زیر لب، آیا اور اپنی نشست پر متمکن ہو گیا، ساتھیوں نے اسے گھیر لیا اور مبارکباد دینے لگے،

واہ وا ——————— کتنی شاندار تقریر کی ہے، سجاد صاحب آپ نے،

پھر تو وہ کاؤں کاؤں ہوئی کہ سجاد کے آتے گئے حواس غائب ہو گئے اس نے بے بسی سے ڈاکٹر شاکر کے متبسم چہرے کی طرف دیکھا، پھر ایک فریادی کی طرح مجمع پر نظر ڈالی، جواب تالیاں پیٹ رہا تھا اور پھر گردن جھکا کر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا،!

اب صفدر کی باری تھی،

صفدر کے لئے یہ بڑی نازک گھڑی تھی، اس کے سامنے انور اور سجاد کا دردناک انجام تھا،

اگر وہ ذرا بھی حواس کھو بیٹھتا تو کہیں تھل بیٹھ جانہ لگتا ہلیکن وہ قوتِ ارادی کی نعمت سے مالا مال تھا، اس نے بالکل فراموش کر دیا، کہ ابھی سجاد اور انور پر کیا گزری تھی، اس نے یہ بھی فراموش کر دیا کہ سامنے جو مجمع بیٹھا ہے انور اور سجاد کی ناکامی کے باعث اس کا موڈ بدل چکا ہے، اب وہ سنجیدہ نہیں ہے، مذاق اڑانے پر آمادہ ہے،

سب سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اس نے تقریر شروع کی،

شروع میں تو اس کی آواز مدھم تھی، ایک آدھ طرف سے کوئی فقرہ بھی چست ہوا، کسی نے کہا

"ہم بہرے ہیں ذرا زور سے بولئے،!"

ایک اور آواز آئی،

(۴)

ہال میں اپنی ہمجولیوں اور کلاس فیلو لڑکیوں کے ساتھ صبیحہ بھی موجود تھی، شوکت اور صفدر کی کامیابی پر اس نے بھی تالیاں بجائی تھیں، سجاد اور انور کی بے بسی پر اسے بھی ہنسی آئی تھی

جب وہ ہال میں پہنچی، اسی وقت اس کی سہیلیوں نے اُسے گھیر لیا، سلمیٰ نے پوچھا،

"آج تم بھی تقریر کرو گی نا؟"

وہ کہنے لگی،

"جی نہیں۔"

نوشابہ نے اصرار کیا،

"نہیں اس مقابلہ میں حصّہ لینا پڑے گا"

وہ گویا ہوئی،

بعض نے تو اس قابلِ رشک اور قابلِ فخر کامیابی پر اسی وقت مٹھائی کا مطالبہ بھی کر دیا، ایک صاحب جو ذرا زیادہ بے تکلف تھے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال روپیہ نکال لینے میں کامیاب ہو گئے کہ مٹھائی کا افتتاح اسی روپیہ سے ہوگا!

"میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا ہے، جائیے تشریف لے جائیے حسرت پوری کر لیجئے!"

اختری بولی،

"ٹال مٹول سے کام نہیں چلے گا، !"

ساحرہ نے کہا، ایک نمائندہ ہم لڑکیوں کا بھی تو ہونا چاہیئے،
——— یہ کیا لغویت ہے، ایسے موقعوں پر لڑکے ہی ہمیشہ بھیجے جاتے ہیں، کیوں نہ کسی لڑکی کو بھی موقع دیا جائے،

صبیحہ گویا ہوئی،

"لیکن نہ ہارڈونگ کالج کی طرف سے کوئی ممانعت ہے، نہ ہمارے کالج نے کوئی پابندی عائد کی ہے، جو لڑکی چاہے مقابلہ میں حصہ لے سکتی ہے اور اگر کامیاب ہو جائے تو نمائندہ منتخب کر کے بھیجی جا سکتی ہے،

سلمیٰ جھگڑنے لگی"

"تو پھر اٹھو یہاں بیٹھی کیوں بک بک کر رہی ہو؟"

وہ ہنسنے لگی

"نا بھائی بخشو، ——— مرغی لنڈوری ہی بہتر، مجھ میں اتنے بڑے مجمع کا مقابلہ کرنے کی ہمت کہاں، ———"

ساحرہ نے مذاق اڑایا،

"اے ہے بڑی بزدل ——— جیسے یونین کے جلسوں میں ہم نے صبیحہ خانم کی تقریر کبھی سنی ہی نہیں!"

صبیحہ نے جواب دیا،

"یونین کی بات اور ہے،

سلمیٰ نے اعتراض کیا،

"کیا وہاں کسی سے لکھا کر لاتی ہو؟"

صبیحہ مسکرائی،

"ہاں، آخر تم نے میری چوری پکڑ لی نا؟"

اختری بولی،

"بھئی یہ باتیں ختم کرو ——— صبیحہ تمہیں تقریر ضرور کرنا پڑے گی ورنہ ہم خفا ہو جائیں گے!"

سلمیٰ نے مذاق اڑایا،

"ارے بھئی ایسا غضب نہ کرنا، اگر کہیں تم ہماری صبیحہ سے خفا ہو گئیں تو مجبوراً اسے زہر کھا لینا پڑے گا!"

سب سہیلیاں ہنسنے لگیں، سلمیٰ نے پھر مطالبہ کیا،

"صبیحہ ضد نہ کرو، تم تقریر کر سکتی ہو، اور مجھے یقین ہے، کامیاب بھی ہو گی،!

صبیحہ نے انور اور سجاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا،

"کیا ان بیچاروں کا حشر دیکھ لینے کے بعد بھی اتنی پُر امید ہو؟"

اختری نے اصرار کیا،

"ہاں ہیں، انور اور سجاد کی طرح تمہاری گت نہیں بن سکتی، یہ تو

ہمیشہ کے لیڈر ہیں، تم ان سے کہیں اچھی تقریر کرتی ہو!"

لیکن صبیحہ رضامند نہ ہوئی، اس نے صاف صاف کہہ دیا،

"سوچا تو تھا کہ میں بھی اس مقابلہ میں حصہ لوں گی، لیکن بھائی انور صاحب اور سجاد صاحب کا حشر دیکھ کر ہمت نے جواب دے دیا، اب کسی طرح بھی اسٹیج کی طرف میرے قدم نہیں اٹھ سکتے!"

انہی باتوں کے دوران میں صفدر کی تقریر ختم ہو گئی،

سلمیٰ نے ٹھوکا دیا،

"خدا کے لئے صبیحہ ضد نہ کرو، یہ موقع ضائع کرنے کا نہیں ہے!"

وہ ہنسنے لگی،

"پہلے تو انور اور سجاد کی ناکامی نے میرا حوصلہ پست کر دیا تھا، اب صفدر صاحب کی اس زبردست کامیابی نے میرے چھکے چھڑا دیئے ہیں — — نا بابا میرے بس کا یہ روگ نہیں!"

اختری نے غصہ سے اسے گھورتے ہوئے کہا،

"نہیں مانو گی؟"

صبیحہ نے اداکاری کرتے ہوئے کہا،

"نہایت افسوس اور ادب کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ نہیں!"

ساحرہ ہنسنے لگی، اس نے سلمیٰ سے کہا،

"یہ اس طرح نہیں مانے گی، اب تمہیں ہمت کرنی چاہیئے!"

صبیحہ نے بھی تائید کی،

"ہاں ساحرہ یہ تم نے بڑے پتہ کی بات کی، واقعی اگر سلمیٰ اسٹیج پر پہنچ گئی تو لطف آجائے گا، میرا دل گواہی دیتا ہے یہ سب سے بازی لے جائے تو!"

سلمیٰ نے شریر نظروں سے صبیحہ کو دیکھا۔

"تو پھر اجازت ہے؟"

وہ خوش خوش بولی،

"ہاں، ہاں ضرور ضرور!"

یہ وہ وقت تھا کہ ڈاکٹر شاکر اعلان کرنے کھڑے ہو گئے تھے کہ مقابلہ ختم ہو گیا، تھوڑی دیر میں نتیجہ کا اعلان کر دیا جائے گا، اچانک سلمیٰ اٹھ کو کھڑی ہو گئی، ڈاکٹر شاکر نے اسے کھڑا دیکھا تو دریافت کیا،

"تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟ ——— کیا تقریر کرو گی؟"

وہ بولی،

"جی تقریر تو نہیں کروں گی مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ صبیحہ نے بھی تیاری کی ہے، انہیں بھی موقع ملنا چاہیئے،

ڈاکٹر شاکر نے خندہ جبیں سے کہا،

"بڑی خوشی سے!" ———"

پھر صبیحہ سے کہا،

"آؤ ——— مجھے تو افسوس تھا کہ تم نے اس مقابلہ میں حصہ کیوں نہیں لیا"

مسحور کر لیا، وہ تقریر کر رہی تھی، اور سارا مجمع دم بخود اس کی تقریر سن رہا تھا،

کوئی آدھ گھنٹہ تک اس نے تقریر کی، جب وہ تقریر کر کے فارغ ہوئی تو پانچ منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا، ڈاکٹر شا کرنے کہا،

"صبیحہ مجھے، اور کالج کو تم پر فخر ہے!"

تھوڑی دیر کے بعد کمیٹی نے دو امیدوار نامزد کر دیئے ———— صفدر اور صبیحہ!

شوکت کا منہ یہ فیصلہ سن کر اتر گیا، سجاد اور انور، شوکت کا یہ رنگ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے،!

صبیحہ اٹھ کر معذرت کرنے والی تھی کہ مجمع نے خیر مقدمی تالیاں بجانا شروع کر دیں، ادھر سلمیٰ، اختری اور ساحرہ نے آسے کچوکے لگا لگا کے کھڑا کر دیا، اب وہ عجیب پوزیشن میں تھی نہ انکار کر سکتی تھی، نہ تقریر کرنے کا حوصلہ تھا، اتنے میں پھر ڈاکٹر نشاط نے کہا،

"آؤ صبیحہ، !"

صبیحہ دل ہی دل میں کانپتی اور لرزتی اسٹیج پر پہنچی!

اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا حلق خشک، زبان سوکھی ہوئی، ہونٹوں پر اتنی ہی دیر میں پپڑی جم گئی تھی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا، اتفاق سے اس کی نظر سب سے پہلے سجاد اور انور پر پڑی، ان کی ناکامی کا تصور اسے پریشان کرنے لگا، دل نے کہا تیرا بھی یہی حشر ہوگا، لیکن قدرت کی طرف سے وہ غیر معمولی قوتِ ارادی کی حامل تھی، وہ اسٹیج پر آن اور شان کے ساتھ جلوہ گر ہوئی

"اس تمکنت سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا،" ________

مجمع ساکت تھا، کچھ لوگ منتظر تھے کہ وہ ذرا لغزش دکھائے تو ایک آدھ ہلکا پھلکا سا فقرہ چست کر دیں، بعض لوگ امید و بیم کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں یہ کیا گل کھلاتی ہے۔

آخر اس نے تقریر شروع کی اور ایک طوفان کی طرح سارے مجمع پر چھا گئی، الفاظ کا اتار چڑھاؤ، مفہوم و معنیٰ کی گہرائی لب و لہجہ کا پیچ و خم خیالات کی بلندی، زبان کی پاکیزگی، ان سب چیزوں نے مجمع کو

(۵)

ہارڈنگ کالج کا منظر آج قابلِ دید تھا!

جھنڈیوں اور بیرقوں سے کالج کا چپہ چپہ ڈھکا ہوا تھا، مقامی کالجوں کے علاوہ سارے ملک کے بڑے کالجوں کے نمائندے شرکت کے لئے دور و دراز کا سفر کر کے یہاں پہنچے تھے، ہارڈنگ کالج کے طلبہ رہنما کار کی حیثیت سے مہمانوں کی پذیرائی کر رہے تھے، طالبات کا گروہ، مہمان طالبات کے خیر مقدم اور خاطر داشت کے لئے وقف تھا، مباحثہ میں حصہ لینے والے مقامی اور بیرونی طلبہ کی تعداد کسی طرح تین سو سے کم نہیں تھی، ہر کالج کے نمائندے طلبہ پر مشتمل تھے، کوئی لڑکی کہیں سے نمائندہ بن کر نہیں آئی تھی، یہ فخر صرف قومی کالج کو حاصل تھا کہ اس نے مس صبیحہ کو اس ملک گیر مباحثہ میں حصہ لینے کے لئے بھیجا تھا۔ طالب علم خواہ کسی جنس سے تعلق رکھتے ہوں، حیرت اور استعجاب کی نگاہوں سے صبیحہ کو دیکھ رہے تھے، وہ

یہ سوچ کر حیران رہ جاتے تھے کہ یہ دھان پان، ڈبلی پتلی، نازک اندام لڑکی اتنے بڑے مجمع کے سامنے ایسے اہم موضوع پر کس طرح خطابت کے جوہر دکھائے گی؟ اس کی آواز کا رس، نغمہ و موسیقی کے لئے ہے، یا شعر و سخن کے لئے، نہ کہ علمی اور ٹھوس تاریخی عنوانات پر مباحثہ کے لئے بزمِ مشاعرہ ہوتی، اور مس صبیحہ لہرا لہرا کر کوئی پھڑکتی سی غزل پڑھتیں، تو ایک بات بھی تھی، اگر کوئی موسیقی کانفرنس ہوتی اور مس صبیحہ اپنے کمالاتِ نغمہ کا مظاہرہ کرتیں، تو کون سنگدل تھا جو ان کے خیر مقدم پر، بلکہ ان کے آگے سر جھکانے پر اپنے تئیں مجبور نہ پاتا، لیکن ایک انٹر کالج مباحثہ میں شرکت کر کے مس صبیحہ نے بہت غلط قسم کی خود اعتمادی کا ثبوت دیا ہے،

لڑکوں اور لڑکیوں میں تجسس بھی ایک چرچا تھا، ایک طرف لڑکوں میں کھسر پھسر ہو رہی تھی، دوسری طرف لڑکیوں میں کانا باتی کا سلسلہ جاری تھا،

لڑکوں کے گروہ میں سے جو مختلف کالجوں سے تعلق رکھتے تھے، ایک صاحب نے صبیحہ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے کہا،

"ماننا پڑے گا —————— دستِ قدرت کی بنائی ہوئی تصویر ہے یہ!"

ساتھی نے کہا،

"کیا بکتے ہو، تصویر! یہ تصویر ہے، تصویر تو خاموش رہتی ہے یہ تو تقریر کرنے آئی ہے۔"

یارانِ بے تکلف کے مجمع میں ایک مرتبہ پھر قہقہے گونجنے لگے ——

کئی حریص اور للچائی ہوئی نظریں بیک وقت اس کے چہرۂ زیبا تک گئیں اور واپس آ گئیں، !

کئی دوست ہنسنے لگے، پھر ایک بولا،

"خدا کی قسم کیا سج دھج ہے ۔ ———— قدِ رعنا ہیں وہ دم خم

کہ بلائیں بھی مرید ———— !"

دوسرے نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا،

"دل کشی چال میں ایسی کہ گوہر بھی شہید!"

تیسرے نے شعر پڑھنے کی کوشش کی،

"وہ صباحت، وہ ملاحت وہ قیامت ————"

————

پھر آگے کوئی قافیہ نہ ملا، ایک مرتبہ پھر یہ سارے ساتھی ہنس پڑے ۔

ذرا دیر کے وقفہ کے بعد ایک صاحب گرم گفتار ہوئے

"جہاں تک صورت کا تعلق ہے دل فریب ہے، جہاں تک آواز کا تعلق ہے سامعہ نواز ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کانوں میں کوثر و تسنیم کے بوند پڑ رہے ہیں، لیکن ————"

ایک ساتھی نے ٹہوکا دیا،

"ہاں لیکن ———— آگے؟"

وہ صاحب مسکراتے ہوئے گویا ہوئے،

"لیکن یہ بت کسی طرح رام ہوتا نظر نہیں آتا ———— تمکنت تو دیکھو معلوم ہوتا ہے ملکہ ایلزبتھ سے لڑ کر چلی آ رہی ہیں ۔

نزہت ایک چلبلی سی شوخ و شریر لڑکی نے کہا،

"جی تو واقعی چاہتا ہے کہ ڈوب مریں!　　　　غضب
خدا کا ہم لوگ یونہی جھک مارتے رہ جائیں اور ایک دوسرے کالج کی لڑکی مرد میدان بن کر بیچ میں آ کودے، ہمارے (بارڈنگ) کالج میں ایک سے ایک خطیبہ موجود ہے، یہ فرخندہ جب اسٹیج پر آتی ہیں تو لوگ دل تھام لیتے ہیں، یہ سائرہ بیگم جب پر پرواز پیدا کر کے منقار کھولتی ہیں تو سب گوش ہوش سے ان کا چہچہانا سننے لگتے ہیں، لیکن آج کے مباحثہ میں حصہ لینے کا ہیاؤ، نہ فرخندہ کو پڑا، نہ سائرہ کو، قومی کالج کا یہ (صبیحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) گل نودمیدہ کو چیلنج کرتا میدان میں آگیا!"

سائرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا،

"کیا کریں بھئی ارادہ تو تھا لیکن ہمت جواب دے گئی، دیکھو تو کہاں کہاں سے لڑکے امنڈ آتے ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر شیطان بھلا ان کے سامنے لب کشائی آسان ہے؟ ——————"

فرخندہ نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا،

"اور یہ (صبیحہ) صاحبہ جو اپنی ہرن کی سی بڑی بڑی آنکھوں سے مجمع پر بار بار نظر ڈال رہی ہیں، دیکھ لینا اسٹیج پر پہنچ کر اگر چوکڑی نہ بھول جائیں تب کی بات! ——"

سب آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں، اندیشہ تھا اگر قہقہے کی آواز بلند

(۶)

طالبات کا گروہ لڑکوں سے الگ تھا،!

اور یہ گروہ بھی زیادہ تر اپنے اپنے کالج کی لڑکیوں میں بٹا ہوا تھا، شاید ہی کوئی ٹولی ایسی تھی، جس میں کئی کالجوں کی لڑکیاں گھل مل کر شیر و شکر ہو کر بیٹھی ہوں، ان مختلف ٹولیوں کی لڑکیاں آپس کی چہلوں میں، ہنسی دل لگی میں مصروف تھیں،

فرخندہ نے صبیحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اپنی ٹولیوں کی لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا،

"ڈوب مرو تم لوگ چلو بھر پانی میں!"

ایک دوسری لڑکی سائرہ بولی،

"یہ بھی اچھی رہی! تم تو زندگی کے مزے لوٹتی رہو، ہم ڈوب مریں ——— آخر کس جرم میں؟"

لیکن اور فن بھی ہے، جس میں ان صاحب کو کمال حاصل ہے!"

"وہ کون سا فن ہے؟"

"وہ ہے رونا ——— دیکھ لینا اسٹیج پر تبسم کی بجلیاں گرائی جائیں گی اور جب واپس آئیں گی تو اشک گہر ریز کی لڑیاں حلقۂ چشم سے باہر گر رہی ہوں گی ،!"

"یہ کیوں؟"

"ایسے قابل اور اتنے بڑے مجمع میں بکواس کرنے کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے!"

"لیکن مزہ آجائے اگر یہ جیت جائے ٹرافی اسی کو ملے ——— یہ لڑکے صاحبان جو اپنے سوا کسی کو کام میں نہیں لاتے منہ دیکھکر رہ جائیں!"

"ساری تیزی اور طراری بھول جائیں!"

آہستہ آہستہ ہنسی کی آواز پھر اس حلقہ میں گونجنے لگی۔

ہوئی تو لڑکوں کے مجمع سے کورس شروع ہو جائے گا،

اب بیچاری صبیحہ کے سراپا پر نقد و تبصرہ شروع ہو گیا، مختلف قسم کے ریمارک سرگوشی کے انداز میں پاس کیے جانے لگے،

"سنتی ہو جی، آخر یہ صاحبہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں؟"

"ہاں دیکھو تو سہی معلوم ہوتا ہے کوئی ملک فتح کر کے آئی ہیں!"

ملک فتح کر کے آئی ہوں یا نہ آئی ہوں، لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب سے ہال میں تشریف لائی ہیں، تار تو ڑ دلوں کو فتح کرتی چلی جا رہی ہیں!" ——— ذرا غور کرنا کتنی گستاخ نگاہوں کا ہدف بنی ہوتی ہے یہ لڑکی!"

"مگر کیا مجال ہے، جو ذرا بھی کسی کو خاطر میں لاتے!"

"گویا وہ اپنے طرز عمل سے ثابت کر رہی ہے، کارواں گذرتا رہتا ہے اور کتے بھونکتے رہتے ہیں!"

"نہیں، ——— چاند چمکتا رہتا ہے، اور کتے چیختے رہتے ہیں!"

"سنا ہے قومی کالج کی مایہ ناز طالبات میں سے ہیں!"

"ہوں گی!"

"معلوم تو ہوتی ہیں!"

"کوئی کہہ رہا تھا، گاتی بھی بہت اچھا ہیں!"

"ہم نے تو یہ بھی سنا ہے، فن رقص میں بھی مہارت حاصل ہے"

طے کر لیا کہ پسپائی نہیں اختیار کرے گی میدان میں پہنچ جانے کے بعد بھاگنا بزدلی ہے، اور قومی کالج کے نام نیک پر اپنی اس کمزوری کا مظاہرہ کر کے وہ دھبہ نہیں لگائے گی،

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کا دل ٹھہر گیا، اطمینان کی کیفیت پیدا ہو گئی اس کے اندر!

وہ محسوس کر رہی تھی لڑکوں اور لڑکیوں کے مجمع میں اس پر نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں، اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اس کی ناکامی کی پیشین گوئیاں کی جا رہی ہیں، لیکن اب وہ ان باتوں سے بے پرواہ تھی، اب وہ ہر طرح کی صورت حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی،

یکایک گھنٹی بجی

یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب جلسہ کی کارروائی شروع ہوا چاہتی ہے

گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مسٹر فریزر تالیوں کی گونج میں کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے، انہوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں آج کے جلسہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی، پھر زیر بحث عنوان کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا، اس کے بعد طلبا اور طالبات کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا،

آپ اسٹیج پر اس طرح آیئے جس طرح ایک فاتح کشور کشا، اپنی مفتوح فوج کے سامنے کھڑا رہتا ہے، جو طلبہ آج اس کالج کے ہال میں اپنی ذہانت، فراست، طاقت، لسانی اور رسائی فکر کا ثبوت دیں گے، وہی کل اپنے ملک اور اپنی قوم کے ناخدا بنیں گے، آج کے لڑکے کل

(۷)

صبیحہ، سب سے بے پروا، سب سے الگ، اپنی نشست پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی، اس نے ہال میں داخل ہوتے ہی اندازہ کر لیا تھا، آج اس کی خیریت نہیں ہے، لڑکوں اور لڑکیوں نے، جن نگاہوں سے اس کا استقبال کیا تھا، ان میں رقابت، حسد، برہمی، اشتعال، گستاخی بدنظری، رکاکت، ابتذال، نہ جانے کیا کیا کچھ تھا، ایک مرتبہ تو اس کا جی چاہا کہ اپنا نام واپس لے لے، اور واپس چلی جائے، لیکن یکایک ڈاکٹر شاکر کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی، کتنے اعتماد اور کتنی مسرت کے ساتھ انہوں نے مجھے رخصت کیا تھا،

اگر میں واپس چلی گئی تو انہیں صدمہ ہوگا، یہ بات ان کی ناگواری کا سبب ہوگی!

یکایک اس میں استقلال اور استقامت کا جذبہ پیدا ہوا، اس نے

ناصر، شہاب، اکرام محمود اور صفدر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں،

سب سے آخر میں صبیحہ کا نام پکارا گیا ———— !

مجمع کے ایک گوشہ سے کسی دل جلے نے کہا،

"اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی !"

سارا ہال تالیوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا!

صبیحہ اسٹیج پر آ کر کھڑی ہو گئی، وہ اس وقت قرمزی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی، سادگی کا مجسمہ، وقار کی تصویر، مجمع کے اس معاندانہ رویہ نے جس میں مختلف کالجوں کے لڑکے بھی پیش پیش تھے، اور لڑکیاں بھی، اس پر برہمی کی کیفیت پیدا کر دی تھی، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، رخسار سرخ ہو رہے تھے، کان کی لویں تک جھنجھنا اٹھی تھیں، اس نے ابھی تقریر کرنے کے لئے لب نہیں کھولے تھے کہ مجمع سے کسی نے آواز لگائی،

"لائے اس بت کو التجا کر کے، ———— "

دوسرا مصرعہ دوسرے گوشہ سے پورا کیا گیا،

"کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے ! ———— "

پھر قہقہہ کا ایک شور بلند ہوا،

مسٹر فریزر کرسیٔ صدارت پر بے بسی سے بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جھینپ رہے تھے، پیچ و تاب کھا رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں، طلبہ کی نفسیات سے واقف تھے، انہوں نے سوچا، یہ موقع زجر و توبیخ کا نہیں ہے، ورنہ اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے، اور اس صورتِ حال

کی قوم ہیں، آج کے طالب علم کل کے لیڈر ہیں، اپنے میں وہی حوصلہ وہی عزم، وہی جوش اور وہی قوت ارادی پیدا کیجئے جو آج آپ کو سرخرو اور کل آپ کو نامور بنا دے!"

مسٹر فریزر کی تقریر نے کانا باقی اور سرگوشی کا سلسلہ یکسر بند کر دیا، وہی لڑکے اور لڑکیاں جو ابھی ذرا دیر پہلے تک ہنسی مذاق ٹھٹھول اور بھکڑ پن کے مظاہرے کر رہے تھے، اب اس طرح سنجیدہ ہو بیٹھے تھے. جیسے شوخی اور شرارت سے یہ واقف ہی نہیں ہاں!

اب مسٹر فریزر نے فہرست کے مطابق باری باری لڑکوں کو بلانا شروع کیا، تھوڑی ہی دیر میں مجلس مباحثہ کا یہ اسٹیج کسی ناٹک کا اسٹیج نظر آنے لگا،

بہت کم طلبا ایسے تھے، جو اپنے موضوع پر ناخنی کسی قسم کی تیاری کر کے آئے ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجمع کو دیکھ کر گھبرا گئے، مجمع تو ایسے نادر موقعوں کا منتظر ہی رہتا ہے اس نے تالیوں پر دھر لیا، تماشہ دیکھنے آئے تھے، تماشہ بن کر واپس گئے،

صرف چند لڑکے ایسے تھے جو اس مجمع کے سامنے اپنے آپ پر قابو رکھ سکے، اور بغیر کسی جھجک کے اپنے موضوع پر زوردار تقریر کرنے میں کامیابی حاصل کر سکے، جس مجمع نے جو اس باختہ لڑکوں کی درگت بنائی تھی، اس نے ان باہمت طلبا کو داد دینے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، طلبہ میں مختلف کالجوں کے جن چند لڑکوں کی تقریریں پسند کی گئیں، ان میں

آنے کے بعد، آپ کے منہ سے جو الفاظ اور اشعار میرے کانوں نے سنے
میں نے تو اس سے یہی نتیجہ نکالا کہ اس طرح اس نامانوس اور اجنبی فضا سے
آپ مجھے مانوس کرنا چاہتے تھے، تا کہ میری جھجک دُور ہو جائے، اس
عنایت کا میں شکریہ ادا کرتی ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ کسی قدر افسوس
کے ساتھ یہ عرض کر دینا چاہتی ہوں کہ آئندہ ماہ ہمارے کالج میں بھی
ایک اسی طرح کی تقریب ہونے والی ہے، وہاں آپ حضرات ضرور تشریف
لائیں گے، مگر یہ سوچ کر زحمت کیجیئے گا، کہ ہم لوگ اس انداز میں آپ کا
خیر مقدم نہیں کر سکیں گے، جس طرح آپ نے مجھ ناچیز کا کیا ہے۔"

صبیحہ کے یہ ابتدائی فقرات کچھ ایسے اثر انگیز ثابت ہوئے کہ معلوم
ہوتا تھا، سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا ہے، وہ قہقہے، وہ فقرے، وہ
شوخی، وہ بذلہ سنجی، وہ استہزا جس کا ابھی ابھی یہ ہال مرکز نظر آ رہا تھا،
اب ایک سناٹے میں بدل گیا تھا، ایسا سناٹا کہ اگر سوئی بھی گرے تو اس
کی آواز سن لی جائے، صبیحہ نے مہذب اور شائستہ الفاظ میں جس طرح طلبہ کے
چھچھورے پن پر تنقید کی تھی، اس نے گھڑوں پانی ڈال دیا ان بیچاروں پر
جن کی گستاخ نگاہی کی وہ شکوہ سنج تھی، اب یہ معلوم ہوتا تھا ——
خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے،

لڑکیوں کے مجمع پر بھی اس تقریر کا بڑا خوشگوار اثر پڑا جو لڑکیاں
خواہ مخواہ اس کی آن اور شان سے جلی جا رہی تھیں، اب وہ بھی تعریف
و تحسین کی نظر سے اُسے دیکھنے لگیں،

کو برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے، عورت کا احترام ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں کے سامنے ایک خاتون کو ہدفِ استہزا بنایا جا رہا تھا. بیچارے بار بار پہلو بدل کر رہ جاتے تھے، اس سے زیادہ اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے،

یکایک اس شورِ استہزا میں ایک باوقار آواز گونجی،

"جنابِ صدر! اور حضرات!

سب لوگ سنبھل بیٹھے!

پھر وہ گویا ہوئی،

"جس پر جوش اور پر تپاک طریقہ پر آپ نے مجھ ناچیز کا استقبال کیا ہے، جس شائستگی اور تہذیب کے ساتھ آپ نے اپنی ایک بہن کا خیر مقدم کیا ہے، جس ساحرانہ ولولہ اور والہانہ جوش کے ساتھ آپ نے ایک سادہ لوح سی لڑکی کی حوصلہ افزائی کی ہے، میں دل سے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، لیکن افسوس اپنے آپ کو مجبور پاتی ہوں مجھے بدقسمتی سے کوئی شعر یاد نہیں ہے، آپ کو ماشاء اللہ دیوان کے دیوان ازبر ہیں، اور اگر کوئی شعر یاد بھی ہوتا، تو بھی آپ کے سامنے اسے پڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، جس ماحول اور جس فضا میں میری تربیت ہوئی ہے، اس میں مجھے یہی سکھایا گیا ہے کہ اپنے کالج اور دوسری درسگاہوں کے طلبہ کو اپنا بھائی سمجھو، ذرا غور تو کیجئے کوئی بہن اپنے بھائیوں کے سامنے اس طرح کی جرأت کا مظاہرہ کسی طرح کر سکتی ہے؛ میرے اسٹیج پر آنے سے پہلے الٹا اسٹیج پر

ہر شخص ان خوش قسمتوں کے نام سننے کا منتظر تھا، جنہیں سندِ کامیابی مرحمت ہوگی،

پرنسپل فریڈ نے تالیوں کی گونج اور مسرت کے شور میں اعلان کیا کہ کمیٹی نے بالاتفاق پہلا انعام مس صبیحہ کو عطا کیا ہے، ٹرافی بھی وہی لے جائیں گی، پھر انہوں نے ایک خوبصورت اور بیش قیمت طلائی گھڑی اپنی جیب سے نکال صبیحہ کی طرف بڑھائی اور گویا ہوئے،

"میری طرف سے ایک حقیر تحفہ ہے!"

اس اعلان نے ایک مرتبہ پھر مجمع میں ہلچل پیدا کر دی، پھر ایک طوفان سا آگیا، پھر ایک مرتبہ وہ شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، اس شور میں دوسرے کامیاب طلبہ کے نام سنائے گئے، لیکن ان ناموں کی طرف کسی نے ذرا بھی توجہ نہ کی، صبیحہ کی اس شاندار کامیابی نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا، اب مجمع اس موڈ ہی میں نہیں تھا کہ کسی اور کو داد دے، کسی اور کی تعریف کرے۔ اس کی جھولی میں داد و تحسین کے جتنے پھول تھے وہ اس نے صبیحہ کے قدموں پر نچھاور کر دیئے تھے، اب اس کا کیسہ خالی ہو چکا تھا،

اس غیر متوقع کامیابی نے صبیحہ پر بھی غیر معمولی اثر کیا، اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے گلنار ہو رہا تھا اس کے تبسم کی دلکشی کچھ اور زیادہ بڑھ گئی تھی، اس کی سحر طرازی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا!

کئی لڑکے اُسے مبارکباد دینا چاہتے تھے، شاید بعض معافی بھی مانگنا

فضا کو اس طرح قابو میں کرنے اور مجمع پر اس طرح اپنا تسلط جمانے کے بعد صبیحہ نے موضوع میں مباحثہ پر تقریر کا آغاز کیا،

شروع میں تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی یہ تقریر پھسپھسی ثابت ہوگی لیکن لمحہ بہ لمحہ، اس کی آواز بلند ہوتی گئی، اس کے الفاظ کا زور بڑھتا گیا اس کے لب و لہجہ میں خطیبانہ شان پیدا ہوتی گئی اس کے بیان کردہ نکات و حقائق میں زندگی لہریں لیتی نظر آنے لگی،

اور جب وہ اپنی تقریر دلپذیر ختم کرکے، اسٹیج سے اتری، تو دیر منٹ تک مسلسل ہال تالیوں کے شور سے گونجتا رہا، سب سے پہلے فرخندہ آگے بڑھی، اس نے اسے گلے سے لگا لیا، اس نے کہا،

"مجھے فخر ہے کہ آپ نے ہماری جنس کا سر اونچا کر دیا، اپنی کامیاب اور سحر طراز تقریر سے"

پھر، ساحرہ، سائرہ اور دوسری بہت سی لڑکیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا،

ابھی ذرا دیر پہلے تک اس کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ اور اب وہ اس سارے مجمع کی ہیروئن بنی ہوئی تھی،

یکایک پرنسپل فریزر کی آواز گونجی،

"حضرات اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیے اب نتیجہ کا اعلان کیا جاتا ہے!"

سب لوگ دم بخود ہو کر بیٹھ گئے۔

کے برجستہ جواب سے جس طرح آپ جیسا تیز و طرار آدمی چوکڑی بھولا ہے یہ عبرت کا مقام ہے اور میں اس موقع پر یہی تحفہ پیش کر سکتی ہوں !

یہ الفاظ فرخندہ نے کچھ ایسی سنجیدگی اور سلاست سے کہے کہ شہاب اور زیادہ حواس باختہ ہو گیا، اس نے کہا،

"میں معافی چاہتا ہوں !"

اور تیر کی طرح جیسے گھیرے کو توڑ کر وہ اندر داخل ہوا تھا، اسی طرح اس حلقہ سے باہر نکل گیا،

اس طرح سٹ پٹا کر اس کے چلے جانے سے پھر ایک مرتبہ لڑکیوں کے گروہ میں فاتحانہ شور بلند ہوا، اور وہ بیچارہ دم دبا کر کھسک گیا،

اس کے جانے کے بعد مختلف لڑکیوں کی طرف سے صبیحہ کو دعوتیں دی جانے لگیں، بعض نے آٹوگراف بک پیش کر دی کہ دستخط کر دیجئے، صبیحہ نے جواب دیا۔

"نہیں بھئی، میں ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی ہوں !"

ساجدہ جو پستہ قد تھی، کہنے لگی،

"دیکھ لیجئے، مجھ سے کتنی بڑی ہیں، دوسروں کو چھوڑیئے، مجھے تو دستخط دے دیجئے اپنے !"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے دستخط کر دیئے!

چاہتے تھے۔ لیکن وہ لڑکیوں کے گھیرے میں اس طرح نظر آ رہی تھی، جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند، اس حالت میں اس تک پہنچنا اسے مبارکباد دینا یا اس سے معافی مانگنا آسان کب تھا، بیچارے ارادہ کر کر کے رہ جاتے تھے، لیکن قریب پہنچ سکیں، یا منہ سے کوئی لفظ نکال سکیں، یہ ناممکن تھا

لیکن شہاب سب سے منچلا ثابت ہوا، وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور اس گھیرے کو توڑ کر صبیحہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا صبیحہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ شہاب خاموش رہنے کے لئے یہاں نہیں آیا تھا، اس نے فرخندہ سے کہا،

"اس مداخلت کی!"

اور صبیحہ سے مخاطب ہوا،

"اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، لیکن کسی طرح بھی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مبارکباد دینے سے اپنے آپ کو نہ روک سکا ———— براہ کرم میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے!"

صبیحہ نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا،

"قبول کر لی!"

سب لڑکیاں اس طرح کھلکھلا کر ہنس پڑیں کہ شہاب جو بڑا حاضر جواب اور نہ کہ سنج مانا جاتا تھا جھینپ گیا، فرخندہ نے چٹکی لی،

"شہاب صاحب آپ مس صبیحہ کو مبارکباد دے چکے، اب میری طرف سے ایک حقیر اور ناچیز تحفہ "ہمدردی" کا قبول فرمائیے مس صبیحہ

میں بلکہ دوسرے مقامی کالجوں میں اس کی دھوم مچ گئی تھی، طلبہ کے حلقہ میں اس نے قابلِ رشک ہردلعزیزی اور شہرت حاصل کرلی تھی، قومی کالج میں "اپنا گھر" میں اور خود اس کے "غریب خانہ" پر جب دیکھو جب مختلف درسگاہوں کی لڑکیاں آرہی ہیں، اسے اپنے ہاں مدعو کررہی ہیں، کسی تقریب میں شرکت پر اصرار کررہی ہیں، اپنے ہاں کے کسی فنکشن میں زبردستی اسے کھینچے لئے جارہی ہیں، اس کی یہ شہرت و وقعت دیکھ کر ایک طرف رقیہ خانم کے بند قبا جوشِ مسرت سے ٹوٹنے لگے تھے، دوسری طرف نعیم صاحب، اپنی قابلِ فخر بیٹی پر اور زیادہ فخر کرنے لگے تھے، لیکن وہ خود اپنی شہرت اور وقعت سے بے پروا خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ وہی محنت اور توجہ سے کالج کے اسباق پڑھتی مطالعہ جاری رکھتی "اپنا گھر" کی خودساختہ ذمہ داری انجام دیتی، نہ غرور نہ تمکنت، نہ تکبر، نہ خودنمائی اس کی بھی روا تھی، جس سے ایک طرف اساتذہ کے دل میں اس کی عزت پیدا کردی تھی، دوسری جانب طلبا اور طالبات کے گروہ میں غیرمعمولی طور پر اس نے ایک مقام حاصل کرلیا تھا جس پر آج تک کم از کم کوئی لڑکی تو نہیں پہنچ سکی تھی،

پھر ایک تازہ واقعہ ایسا ہوا، جس نے اس کی شخصیت میں اور چار چاند لگادیئے۔

کالج کی یونین کا انتخاب ہر سال ہوا کرتا تھا، اس انتخاب کی تیاریاں اس زور شور سے ہوتی تھیں کہ کیا اسمبلی کی ممبری کے لئے لوگ ایسی دواعدوش

(۸)

بعض دفعہ زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے، جو انسان کی شخصیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ صبیحہ یوں تو اپنی سادگی اور شرافت حسن صورت اور حسنِ سیرت، جذبۂ خدمت اور تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے کالج بھر میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی، ڈاکٹر شاکر اور دوسرے اساتذہ کا برتاؤ انہی خوبیوں کے باعث بہت اچھا تھا، اور جب سے پابندی کے ساتھ بغیر کسی کی تحریک کے از خود رضاکارانہ طور پر اس نے "اپنا گھر" میں پہلے ایک گھنٹہ اور بعد میں دو گھنٹہ روزانہ آزیری طور پر کام کرنا شروع کیا تھا ڈاکٹر شاکر کی نظر میں وہ ایک مثالی لڑکی بن گئی تھی، جس کی نظیر وہ دوسری لڑکیوں کے سامنے پیش کر کے ان میں جذبۂ عمل اور جذبۂ خدمت پیدا کرنے کی وہ کوشش کرتے تھے، لیکن جب سے ہارڈنگ کالج کے ڈیبیٹ میں اس نے پہلا انعام حاصل کر کے ثانی جیتی تھی، اس وقت سے نہ صرف قومی کالج

"کیا ہوگا؟ ——— کیا قیامت آجائے گی؛ زمین پھٹ پڑے گی یا آسمان ٹوٹ پڑے گا؟"

صادقہ نے جل کر کہا۔

"ہاں یہی ہوگا! ——— امیدواروں میں صرف دو نام تھے ایک تمہارا، ایک سجاد صاحب کا، چونکہ عمل درآمد کے مطابق اس مرتبہ لڑکی کی باری تھی، لہٰذا تم کامیاب ہو جاتیں اور سجاد صاحب کو اس جرأت کی سزا مل جاتی کہ وہ ایک طے شدہ روایت کو توڑ کر امیدوار سیاست بن رہے تھے، تمہارے نام واپس لینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے،!"

صبیحہ نے بے پروائی سے کہا،

"تو میرا کیا بگڑ جائے گا؛ ہو جائیں!"

نسرین نے صادقہ کی تائید کرتے ہوئے کہا،

"اس انکسار سے ممکن ہے تمہاری نجات ہو جائے اور تم سیدھی جنت میں چلی جاؤ، لیکن لڑکے ہمارا مذاق اڑائیں گے، کہیں گے بی صبیحہ انتخاب جیت نہیں سکتی تھیں، اس لئے دستبردار ہو گئیں ———!"

صبیحہ نے اسے چھیڑا،

"کہنے دو، ان کے مذاق اڑانے سے کیا ہوتا ہے، آؤ ہم تم یہاں ان کا مذاق اڑا لیں، چلو حساب کتاب برابر"

لیکن نسرین تو شاید لڑنے پر آمادہ تھی،

کرتے ہوں گے، طلبا کی باقاعدہ ٹولیاں بن جاتی تھیں اور وہ اپنے اپنے امیدوار کی "کنویسنگ" میں دن رات ایک کر دیتے تھے بعض دفعہ تو حریف جماعتوں میں سرپھٹول تک کی نوبت آجاتی تھی، مزنین کا "کنونشن" یعنی عمل درآمد یہ تھا کہ اگر صدر لڑکا منتخب ہوتا تھا تو سکریٹری لڑکی سکریٹری اگر کوئی لڑکا ہوتا تھا، تو صدارت کسی لڑکی کے حصہ میں آتی تھی، اس مرتبہ صدارت کی باری لڑکی کی تھی، صبیحہ کو منصب اور عہدے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، نہ اسے وہ اپنے لئے ذریعۂ عزت سمجھتی تھی، بعض دوستوں کی طرف سے اس کا نام صدارت کے لئے پیش کیا گیا، لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ نام واپس لے لے گی، اس کا خیال تھا کوئی عہدہ قبول کئے بغیر وہ زیادہ اچھی خدمت وہیں کی کر سکتی ہے،

بورڈنگ میں صادقہ کا کمرہ اس کا مرکز تھا، فرصت کے اوقات وہ یہیں صرف کرتی، دوسری لڑکیاں بھی موقع پا کر یہیں آجاتیں، رفتہ رفتہ صادقہ کے کمرہ نے ایک اچھے خاصے زنانہ کلب کی حیثیت اختیار کر لی،

صبیحہ کے اس فیصلہ کا اس کی سہیلیوں کو علم ہو چکا تھا کہ وہ انتخاب نہیں لڑے گی اور اس فیصلہ پر اس کی ہمجولیاں بہت برہم تھیں، صادقہ نے کہا،

"آخر نام واپس لینے کی تمہیں سوجھی کیا ہے؟ جانتی ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا،

"لیکن میں نے تو یہ سنا تھا ——————"

"آپ نے جو کچھ سنا وہ غلط تھا، میں انتخاب لڑوں گی، اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شکست فاش دوں گی!"

"(تیز لب و لہجہ میں) میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں ——— !"

"(مبتسم ہو کر) شکریہ، اور ہاں ایک بات اور عرض کر دوں میں آپ کو سکریٹری شپ کی پیش کش بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ میں ہرگز آپ کے ساتھ تعاون نہیں کر سکوں گی، بدتمیز اور برخود غلط لوگوں سے میں اسی طرح پیش آتی ہوں، اب جائیے تشریف لے جائیے، لڑکیوں کے کمرہ میں بغیر اجازت آپ کو نہیں آنا چاہیئے، ورنہ یہ بات پرنسپل صاحب تک پہنچ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے آپ کو!"

صبیحہ کی یہ کھری اور بے لاگ باتیں سن کر سٹ پٹا گیا، اس سے کوئی جواب نہ بن آیا، چپ چاپ اٹھا، اور چلا گیا، اس کے جانے کے بعد صادقہ صبیحہ سے لپٹ گئی، اور اس کی پیشانی پر بوسے دینے لگی، صبیحہ نے بڑی مشکل سے اسے پرے ہٹکتے ہوئے کہا،

"توبہ ہے، یہ کیا سوجھ رہی ہے ہٹو!"

صادقہ نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا،

"تیری آواز ملے اور مدینے ——————— صبیحہ تم نے اس وقت سجاد سے جو گفتگو کی ہے مزہ آگیا، واقعی اتنا برخود غلط آدمی ہے کہ ہر جگہ یہی کہتا پھر رہا تھا مس صبیحہ اگر اپنا نام واپس نہ لیں گی تو بری طرح ہاریں گی!"

"اس طرح تم لڑکیوں کا ایک مسلمہ حق چھین رہی ہو!"

صادقہ بولی،

"ہم سب تم پر تجویز ملامت لائیں گے!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"تو انتظار کا ہے کا ہے؟ ——— لو کھڑے ہیں ہاتھ باندھے ہم تمہارے سامنے!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سجاد آ گیا، اس نے کہا،

"مس صبیحہ میں ایک مدبرانہ فیصلہ پر آپ کو مبارکباد دینے آیا ہوں!"

صبیحہ نے انجان بن کر دریافت کیا،

"کیسا فیصلہ؟ میں سمجھی نہیں! ذرا صاف صاف کہئے!"

سجاد نے بتایا،

"یہی کہ آپ انتخاب نہیں لڑیں گی اس طرح آپ شکست فاش کی شرمندگی سے بچ گئیں، لیکن میری پیش کش یہ ہے کہ آپ سیکریٹری شپ قبول کر لیں، میں آپ سے پورا پورا تعاون کروں گا!"

پہلے تو صبیحہ نے تیوریاں چڑھالیں، پھر زیر لب تبسم کے ساتھ گویا ہوئی،

"سجاد صاحب آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں!"

"یعنی ——— یعنی ———؟"

"جی ہاں یعنی یہ کہ نہ میں نے اپنا نام واپس لیا ہے، نہ ایسا ارادہ ہے!"

کے لئے !"

صبیحہ اُٹھ کھڑی ہوئی،

"شکریہ ——————— لیکن یاد رہے کسی لڑکی یا لڑکے کے پاس میں ووٹ کی بھیک مانگنے نہیں جاؤں گی !"

صادقہ نے اطمینان دلایا۔

"ہاں بھئی نہ جانا ! یہ ہمارا کام ہے ہم کریں گے، کیوں بی نسرین !"

وہ آمادگی کے ساتھ بولی،

"ہاں بے شک !"

اور پھر دونوں طرف سے زور شور کے ساتھ کنولینگ شروع ہو گئی تیسرے دن ڈاکٹر شاکر کی موجودگی میں رائے شماری ہوئی،

صبیحہ کو ۲۷۱ ووٹ ملے اور سجاد کو صرف ۲۱ صبیحہ کی صدارت کا اعلان کر دیا گیا، !

اس اعلان نے حامیوں اور مخالفوں کی صف میں عجیب ہنگامہ آرائی پیدا کر دی صبیحہ کا گروہ جوش مسرت سے بے تابو ہوا جا رہا تھا سجاد کی جماعت شکست خوردگی کے احساس سے پانی پانی ہوتی جا رہی تھی، بعض دل جلوں نے تو برسرِ عام سجاد کو ڈوب مرنے کا مشورہ دیا، اس لئے کہ پہلی حماقت اس نے یہ کی کہ ایک لڑکی کے مقابلہ میں امیدوار بن کر کھڑا ہوا اور دوسرے بدقسمتی یہ کہ ہار گیا،

شاید نوبت ہنگامہ آرائی تک آجاتی لیکن ڈاکٹر شاکر کی

نسرین نے کہا،

"اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا حضرت کو!" ———
لیکن انکار کرتے کرتے تم یک بیک راضی کس طرح ہوگئیں؟"

صبیحہ نے کہا،

"کرتی کیا؟ میں تو اپنی عافیت پسندی کے باعث دستبردار ہو رہی تھی، سجاد صاحب نے اسے میری کمزوری پر محمول کیا! اور بندی ان لوگوں میں سے ہے نہیں جو شکست تسلیم کر لیتے ہیں، یہ لاف زنی سن کر میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ تشریف لے آیئے میدان میں، ہو جائیں دو دو ہاتھ!"

صادقہ نے بڑے بھولے پن سے پوچھا،

"اور اگر ہار گئیں؟"

صبیحہ نے کہا،

"تو تم ڈوب مرنا پھر چلو بھر پانی میں!"

نسرین نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا،

"ایسا نہیں ہو سکتا، صبیحہ کامیاب ہوگی، سجاد صاحب شکست کھائیں گے ——— لیکن یہ باتیں بنانے کا نہیں کام کا وقت ہے ہمیں غافل نہ ہونا چاہیئے، کوشش پوری پوری کرنی چاہیئے، ورنہ حریف بازی لے جائے گا!"

صادقہ نے کن انکھیوں سے صبیحہ کو دیکھا اور بولی،

"تو ہمیں کب انکار ہے بھئی، دل و جان سے حاضر ہیں ہر خدمت

سحر طراز شخصیت موجود تھی، اور ان کی موجودگی میں کوئی وحشی صفت اور درندہ خو بھی کوئی ایسی بات نہیں کرسکتا تھا جو انہیں ناگوار ہو۔

وہ اِک نگہ!

بہت دِنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

(۱)

قومی کالج کے کئی لڑکے صبیحہ کو دل و جان سے چاہتے تھے، لیکن حرفِ محبت زبان پر لانے کی کوئی اب تک جرأت نہ کر سکا تھا،

صبیحہ ان لڑکیوں میں نہیں تھی جو آسانی سے اسیرِ دام ہو سکتی ہیں، وہ اتنی بردبار اور اتنی باوقار تھی کہ اس کے سامنے حرفِ محبت زبان پر لانا بڑے دل گردہ والے کا کام تھا، اس کے تبسم میں وہ دبدبہ تھا کہ لوگوں کے آتے حواس غائب ہو جاتے تھے، اس کے التفات میں وہ شکوہ و تجمل تھا کہ آنکھ سے آنکھ ملانے کی ہمت پڑ ہی نہیں سکتی تھی، جب اس کے تبسم اور التفات کے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا تو اس کی چڑھی ہوئی چتون کا مقابلہ کرنا کس کے بس کا روگ تھا؟

مختلف طریقوں سے اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن زبان ارادہ کا کبھی ساتھ نہیں دے سکی اور شہاب کی پٹائی کا واقعہ تو ابھی

نمائش کے لئے رکھی تھیں، جو کھدائی کے دوران میں اس مدفون شہر سے برآمد ہوئی تھیں، شیشہ کے جو کھٹے میں ایک ڈھانچہ پڑا تھا ———— صرف ہڈیاں، گوشت اور کھال کے بغیر ایک مکمل انسان!

سلمیٰ نے دانت کچکچا کر آنکھیں بند کر لیں،

"اوہ، کس قدر بھیانک!"

میوزیم کا منتظم ساتھ تھا، اس نے کہا "یہ ایک لڑکی کی لاش ہے، اس کے معائنہ کے لئے لندن لیجایا گیا وہاں علم الانسان کے ماہرین نے یہ تحقیق کی یہ لاش کسی نوجوان لڑکی کی ہے اس کی عمر کا اندازہ انہوں نے ۲۱ سال لگایا ہے، خیال یہ ہے کہ دق کے مرض میں مبتلا ہو کر مری تھی، ہڈیوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پانچ سو سال قبل مسیح کی لاش ہے،!"

سلمیٰ نے صبیحہ کے ٹھوکا لگایا،

"خدا کے لئے بھئی چلو یہاں سے"!

وہ ہنسنے لگی،

"ڈر رہی ہو"؟

وہ سہمے ہوئے لہجہ میں کہنے لگی،

"ہاں بہت زیادہ!"

صبیحہ نے کہا،

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے، یہ تو عبرت کا مقام ہے!"

سلمیٰ نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا،

بالکل تازہ تھا،

ہوا یہ کہ مقامی کالجوں کے طلبہ اور طالبات کی ایک ٹیم، آثار قدیمہ کے معائنہ کے لئے گورنمنٹ کالج، پرنسپل مسٹر فریزر کی سرکردگی میں، شاہ پور گئی، شاہ پور ایک چھوٹا سا شہر تھا، اس سے چند میل کے فاصلہ پر عہد قبل از تاریخ کے کچھ آثار زمین سے کھود کر نکالے گئے تھے، فریزر صاحب کو آثارِ قدیمہ سے بڑی دلچسپی تھی انہی کی تحریک پر یہ ٹیم بنی، انہوں نے ڈاکٹر شاکر سے بھی استدعا کی کہ قومی کالج کے کچھ لڑکوں کو اس ٹیم میں شامل ہونے کی اجازت دیں، انہوں نے سجاد، صفدر، صبیحہ اور سلمیٰ کو نامزد کر دیا۔

دوسرے روز پندرہ سولہ لڑکوں اور چار پانچ لڑکیوں کا قافلہ پرنسپل فریزر کی سربراہی میں شاہ پور روانہ ہو گیا، شاہ پور ریل سے دو گھنٹہ کا راستہ تھا، یہ مدت آپس کی چہلوں میں بڑی آسانی سے گزر گئی، شاہ پور پہنچنے کے بعد سامان، ڈاک بنگلہ میں رکھا اور ٹیکسیوں پر کھلنڈروں اور بے فکروں کا یہ گروہ آثار قدیمہ کی سیر کو روانہ ہو گیا،

جس جگہ عہد قبل از تاریخ کے آثار برآمد ہوتے تھے، وہاں پہنچنے کے بعد یہ ٹولی مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئی، ایک ٹولی میں، سلمیٰ صبیحہ شہاب اور تین لڑکے اور شامل تھے، یہ لوگ ٹہلتے ٹہلتے ایک کھنڈر کی طرف پہنچے وہاں ایک تالاب کے آثار دیکھے۔ پھر آگے بڑھے تو ایک مکان کی چوحدی نظر آئی، یہاں سے یہ لوگ میوزیم پہنچے، اس میوزیم میں وہ چیزیں

شہاب نے شبہ کا اظہار کیا،

"ممکن ہے آگ آتی ہو!"

منتظم نے بتایا،

"کوشش کی گئی تھی، مگر کامیابی نہیں!"

پھر وہ چند قدم آگے بڑھا، اس نے بتایا،

"دیکھیے یہ اینٹوں کا ڈھیر ہے جو یہاں کے کھنڈرات سے برآمد ہوا ہے کتنی سبک، کتنی مضبوط، کتنی خوشنما، آج بھی ان اینٹوں سے عمارت بن سکتی ہے!"

شہاب نے فقرہ چست کیا،

"یہ اینٹیں اگر ہماری کسی "قومی" درسگاہ میں کسی طرح پہنچا دی جائیں تو تعمیرات کا مسئلہ بڑی خوبی سے حل ہو سکتا ہے!"

صبیحہ نے کڑی نظر سے شہاب کو دیکھا، لیکن خاموش رہی، منتظم پھر آگے بڑھا، چند قدم کے بعد اس نے مٹی کے چند برتنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"یہ گھڑے ہیں، یہ لوٹے ہیں، یہ گلاس ہیں، یہ پیالے ہیں، یہ مرتبان ہیں۔ ان کے نقش و نگار دیکھیے، ان کی "کلر اسکیم" دیکھیے، ان کی نزاکت اور مضبوطی دیکھیے!"

شہاب نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا،

"جی ہاں صاحب دیکھ لیا!"

"بھائی جتنی عبرت چاہنا باہر چل کر حاصل کر لینا، لیکن برائے خدا یہاں سے نکلو کسی طرح!"

میوزیم کا منتظم آگے آگے تھا، اور یہ لوگ پیچھے پیچھے، اور وہ جگہ جگہ رک رک کر مختلف چیزیں دکھا رہا تھا، اور ان کی تاریخ بیان کر رہا تھا،

"یہ دیکھئے ——————— یہ گیہوں ہیں جو کئی من مختلف گھروں سے برآمد ہوئے ہیں!"

صبیحہ نے پوچھا،

"لیکن ان کا رنگ کالا کیوں ہے؟"

وہ کہنے لگا،

"ڈھائی ہزار سال کی مدت کچھ کم تو نہیں ہوتی، وہ ہزار پانچسو سال تک زمین میں دفن رہنے کے بعد یہ نکلے ہیں، لیکن اگر ان کی روٹی پکائی جائے تو اس میں اور آج کے گیہوں کی لذت میں کوئی فرق نہیں ہوتا"

سلمیٰ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا،

"واقعی؟"

وہ بولا،

"جی ہاں تجربہ کیا جا چکا ہے، لذت اور ذائقہ میں ذرا بھی فرق نہیں، لیکن قوت نمو ختم ہو چکی ہے۔ یہ گیہوں اگر بوئے جائیں تو ان سے فصل نہیں اگ سکتی!"

۲۱ سالہ نازنین کی لاش نکلی ہے ———— !

منتظم کی جرأت اور بڑھ گئی،

"کیوں قبر کا کیا کریں گے؟"

شہاب نے جواب دیا،

"شاید وہاں کے کسی گوشہ سے میرے دل مرحوم کی لاش بھی نکل آئے؟"

یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا، اور اس کے تینوں ساتھی بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔۔ بیچارہ منتظم جھینپ گیا، اس نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے کہا،

"اب تو کوئی قابلِ دید چیز نہیں ہے!"

شہاب نے رخصت ہوتے ہوتے کہا،

"آپ کے پاس نہ ہو گی، ہم تو اپنے ساتھ رکھتے ہیں!"

پھر سب ساتھی ہنس پڑے، سلمٰی بھی ان باتوں سے نالاں تھی اور صبیحہ کی ناگواری تو اس کے رنگ رخ سے عیاں تھی!

منتظم پھر آگے بڑھا۔

"یہ دیکھیے ہڈی کے ہیر پن ——————— اس زمانہ کی عورتیں اپنے بالوں میں لگاتی تھیں،!"

شہاب نے کہا۔

"ہمارے زمانہ کی عورتوں کو بھی ان کا شوق ہے، ذرا ہوشیار رہیے گا، کہیں ایک آدھ غائب نہ ہو جائے یونہی دیکھتے دیکھتے!"

منتظم حیرت سے شہاب کا منہ دیکھنے لگا،

"جناب یہ تو شیشہ کے بکس میں بند ہیں!"

شہاب نے ایک قہقہہ لگایا اور گویا ہوا۔

"نہ جانے کس زمانہ کے آدمی ہیں آپ بھی، مجھے شبہ ہوتا ہے کہیں دو ہزار پانچسو سال کے بعد آپ پھر سے زندہ تو نہیں ہو گئے ہیں، جو نگاہیں (صبیحہ کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھتے ہوئے) سنگ و آہن کو چیر سکتی ہیں، ان کے سامنے یہ شیشہ کا بکس ایک نازک سے آبگینہ کے سوا کیا ہے؟"

منتظم بیچارہ واقعی پرانے زمانہ کا آدمی تھا، وہ ان چلتے ہوئے فقروں کا مطلب نہ سمجھ سکا، اس کا بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"آیئے اب میں آپ کو وہ ہال دکھاؤں جہاں اناج ذخیرہ کیا جاتا تھا"

شہاب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا،

"نہیں مجھے وہ قبر دکھایئے جس میں سے دو ہزار پانچسو سال پہلے کی

"ذرا دیر ——— ابھی چلتے ہیں ذرا دیر میں!"

ناصر نے اصرار کیا

"بیٹھ جائیے مس صبیحہ، ہم سب ساتھ آئے ہیں ساتھ چلیں گے —!"

شہاب نے شریر آنکھوں سے اسے دیکھا، اور بولا،

"میری استدعا ہے مس صبیحہ تشریف رکھئے! ———"

وہ بیٹھ گئی،

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر سلمیٰ کہنے لگی،

"وہ لڑکی والی لاش یاد آجاتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں؛"

صبیحہ نے پوچھا،

"آخر کس لئے؟"

وہ کہنے لگی،

"یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ، جس پر نہ گوشت تھا، نہ کھال، نہ رگیں، نہ پٹھے،

کسی زمانہ میں ایک عورت کا جسم تھا، ایک اکیس سال کی دوشیزہ کا جسم!"

صبیحہ نے کچھ سوچتے ہوئے دور افق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"ہاں سلمیٰ یہی بات ہے!"

سلمیٰ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"سوچتی ہوں نہ جانے اس لڑکی کا رنگ روپ، ناک نقشہ کیسا ہوگا؟"

سلمیٰ نے ایک ٹھنڈی سانس لی،

"رنگ روپ اچھا ہو یا برا، ناک نقشہ دلفریب ہو، یا تنفر خراش،

(۲)

میوزیم سے نکلنے کے بعد یہ لوگ پیپل کے ایک بڑے اور گھنے درخت کے پاس پہنچے، شہاب وہیں بیٹھ گیا،

"دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی ہے، اس منتظم کے بچے نے عجائب خانہ کی سیر کرا کے تھکا ڈالا، اب ذرا دیر یہاں بیٹھ کر سستائیں گے!"

سلمیٰ بھی کافی تھک چکی تھی فوراً بیٹھ گئی،

"مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق ہے!"

تینوں ساتھیوں نے بیٹھتے ہوئے کہا،

"بھلا اس تجویز سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔!"

صبیحہ اب تک کھڑی تھی اس نے سلمیٰ سے کہا۔

"پرنسپل فریزر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے چلنا چاہیے!"

وہ بچوں کی طرح اٹھلاتی ہوئی بولی)

صبیحہ کی ان باتوں سے سب ہی متاثر نظر آرہے تھے لیکن دفعتہً شہاب نے کہا،

"مس صبیحہ ایسا نہ کہیئے، کم از کم میں اس دن کے لئے زندہ نہیں رہنا چاہتا جب آپ کا پیکر نازنین ہڈیوں کی صورت میں زمین کی تہ سے برآمد ہو،!"

صبیحہ نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن شہاب کو اس نے تیکھی نظروں سے ایک مرتبہ دیکھا، اور نظریں جھکا لیں اس کی نظروں سے چنگاریاں برس رہی تھیں، یہ کسی نے محسوس نہیں کیا، ورنہ شہاب کے ان فقروں سے لطف اندوز ہو کر اس کے ساتھی ہنسنے نہ لگتے، اس واقعہ سے اس کی ہمت اور بڑھ گئی، اس نے کہا،

"مس صبیحہ آپ کے بارے میں تو غالب ایک پیشگوئی بھی کر گیا ہے!"

ناصر نے پوچھا،

"وہ کیا بھئی، ہمیں بھی تو بتاؤ!"

شہاب نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا،

ہائے کیا بات کہہ گیا ہے، وہ ظالم، وہ شاعر نہیں تھا فلسفی بھی نہیں تھا، ان دونوں سے بڑھ کر کچھ اور تھا ——————،

ناصر نے لقمہ دیا،

"وہ نہ جانے کیا کیا تھا، لیکن ہمیں تو اس کی پیش گوئی سے دلچسپی ہے اور پیش گوئی بھی وہ جو اس نے مس صبیحہ کے بارے میں کی ہے!"

شہاب نے ہنستے ہوئے دریافت کیا،

عارضی چیز ہے، اس کی عمر ۲۰ - ۲۵ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، بہتر سے بہتر صحت ہو تو بھی چالیس پینتالیس سال کے بعد انحطاط شروع ہو جاتا ہے نہ وہ رُوپ رہ جاتا ہے، نہ رنگ ——————"

سلمیٰ ان فلسفیانہ باتوں سے اُکتا چلی تھی،

"آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟"

سلمیٰ نے اُسی لب و لہجہ میں جواب دیا،

"کہنا یہ چاہتی ہوں، کہ رُوپ فنا ہو جاتا ہے، مٹ جاتا ہے، ممکن ہے یہ لڑکی اپنے وقت کی قلوپطرہ ہو، لیکن وہ مر گئی، فنا ہو گئی، باقی رہ گیا ہڈیوں کا وہ ہار جسے ترتیب اور لگا کر ایک ڈھانچہ کی شکل دے دی گئی، سب کا حشر یہی ہوتا ہے، رُوپ مٹ جائے گا، ہڈیاں باقی رہ جائیں گی —————— ہولناک اور دہشت انگیز، درسِ عبرت!"

سلمیٰ بولی

"ہاں صبیحہ کہتی تو ٹھیک ہو!"

صبیحہ نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"یہی حشر ہمارا تمہارا بھی ہوگا، آج ہم آثارِ قدیمہ کی زیارت کرنے یہاں آئے ہیں، ممکن ہے دو ہزار سال بعد، تین ہزار سال بعد، چار ہزار سال بعد زمین کی تہ سے جو آثار و نقوش برآمد ہوں، ان میں ہمارے تمہارے ڈھانچے بھی اسی طرح برآمد ہوں، اور اس وقت کی کوئی صبیحہ، کوئی سلمیٰ، انہیں دیکھ دیکھ کر درسِ عبرت حاصل کر رہی ہو،"

"واقعی سنجیدگی سے پوچھ رہے ہو؟"

ناصر نے جواب دیا،

"ہاں بھئی، بالکل سنجیدگی سے!"

شہاب نے جرح کی،

"لیکن اگر مس صبیحہ نے وہ پیش گوئی ناپسند کی وہ خفا ہو گئیں، روٹھ گئیں تو کیا ہوگا؟"

ناصر نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا،

"خفا اگر ہوں گی، اگر روٹھیں گی، تو غالب سے ہماری تمہاری کیا خطا ہے"،

سب ساتھی ہنسنے لگے، ناصر نے پھر فرمائش کی،

"یعنی اب زیادہ انتظار کی زحمت نہ دو، اشتیاق حدِ برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے!"

صبیحہ کا ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا، اس کا جی چاہ رہا تھا، یہاں سے بھاگ جائے، ناصر کا منہ نوچ لے، شہاب کی مرمت کر دے، لیکن اجنبی لوگ، نیا مقام، ٹیم کا ساتھ۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ بدمزگی حد سے بڑھ جائے، وہ اٹھ کھڑی ہوئی سلمیٰ کا ہاتھ پکڑ کر اس نے کہا،

"چلو!"

سلمیٰ بھی اٹھ کھڑی ہوئی، وہ بھی ان باتوں سے سخت برہم اور ملول تھی۔

"چلو، !"

شہاب نے کہا،

لیکن جانے سے پہلے وہ شعر تو سنتی جائیے —— کہتا ہے آپ کے بارے میں،

؎ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

قہقہوں کے شور میں تڑاق کی آواز آئی شہاب کے گال پر صبیحہ کا بھرپور طمانچہ پڑ چکا تھا ۔

لوگوں میں سے تھا، جو اچھے خاندان میں پیدا ہوئے، اونچی تعلیم حاصل کرنے، اونچی سوسائٹی میں بیٹھنے، شریف اور نیک لوگوں کا فیض تربیت حاصل کرنے کے باوجود عورت کے احترام پر کسی طرح اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پاتے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر آج بھی حالات سازگار ہوں اور ان کا بس چلے، تو نہایت ذوق و شوق سے سر بازار خوبصورت اور طرحدار عورتوں کو خریدیں اور انہیں لونڈی، باندی بنا کر رکھیں، انہیں قیمتی زیور پہنائیں، اچھے کپڑے پہنائیں عمدہ سے عمدہ کھانا کھلائیں، لیکن رشتہ وہی قائم رکھیں، جو آقا اور لونڈی کا ہوتا ہے بالکل یہی ذہنیت شہاب کی تھی

قومی کالج کی طرح گورنمنٹ کالج میں بھی مخلوط تعلیم رائج تھی، یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی، وہاں بھی ہر طرح کی لڑکیاں پڑھتی تھیں، وہ بھی جن کا تبسم ایک مستقل دعوت التفات تھا، اور وہ بھی جن میں وقار اور شائستگی تھی، لیکن شہاب دونوں میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، وہ مسکراتی ہوئی لڑکیوں کے سامنے سنجیدہ بن جاتا تھا متین اور خاموش لڑکیوں کے سامنے اس کی زبان طرارے بھرنے لگتی تھی جو اس کی طرف مائل تھیں انہیں وہ ٹھکراتا تھا، جو اس سے جھجکتی تھیں انہیں اپنی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور زندہ دلی سے موہ لیتا تھا، اور اس کے بعد پھر ان سے نظریں پھیر کر ان کی پریشانی اور اضطراب کا تماشہ دیکھتا تھا اور لطف لیتا تھا، جس طرح صیاد کسی مرغ گرفتار کو

(۳)

یہ حادثہ اتنا یک بیک اور خلاف توقع ہوا کہ سب لوگ دنگ اور ششدر رہ گئے، مرگ کا سا سکوت طاری ہو گیا سب پر،

لیکن صبیحہ نے کوئی پروانہ کی اس نے سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور چلی گئی،

شہاب کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، وہ بے انتہا مشتعل اور برہم نظر آرہا تھا، لیکن شرمندہ اور نادم بھی تھا، یہ دونوں کیفیتیں بیک وقت اس پر طاری تھیں ——— غضب اللہ کا کہ یاران بے تکلف کے سامنے پٹا، یہ لوگ اس وقت تو خاموش ہیں. بعد میں نہ جانے کس طرح حاشیہ آرائی کر کے بڑھا چڑھا کے اس واقعہ کو بیان کریں گے، شرمندگی اور ندامت اس بات کی کہ اپنی یاوہ گوئی کے باعث ایک لڑکی کے ہاتھ سے پٹ گیا ——— یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا،

شہاب اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اور تیز طرار لڑکا تھا، لیکن ان

یہی وجہ تھی کہ جب شہاب صاحب نے راستہ میں اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ شروع کیا، یا جب میوزیم کے عزیب منتظم کے سامنے نعرہ بازی شروع کی، یا جب اس نے "قومی اداروں" کے لئے برآمد شدہ کھنڈرات کی اینٹیں بجھانے کی تجویز پیش کی تو اس کے ماتھے پر شکن آ گئی تھی، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا، سوچا، تھوڑی دیر کی اس رفاقت کو کیوں بد مزگی اور ناخوشگواری کی نذر کیا جائے،

لیکن جب شہاب نے حد سے باہر قدم رکھا اور براہِ راست ذاتی حملے کر دیئے تو اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی، وہ اپنے اقدام وعمل کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ رہی سہی کسر شہاب صاحب نے غالب کا شعر پڑھ کر پوری کر دی، یہی واقعہ فیصلہ کن ثابت ہوا، پھر اس نے نتیجہ سے بے پروا ہو کر بے ساختہ اس کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا

یہ حملہ اتنا فوری تھا کہ سب ہی بھونچکے رہ گئے، اور اب تک ایک عجیب شکست خوردگی کی کیفیت طاری تھی، اگرچہ اسے گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی،

آخر کچھ دیر کے بعد ناصر نے طلسم سکوت توڑا،

"آؤ بھئی شہاب چلیں ——— اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی!"

شہاب نے کوئی جواب نہیں دیا چپ چاپ حاضر ہو لیا۔

اسیر دام کر کے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ہارڈنگ کالج کے ڈبیٹ میں پہلی مرتبہ شہاب نے صبیحہ کو دیکھا تھا اور اس کے وقار، شائستگی، آن، شان اور سحر طرازی سے متاثر بھی ہوا تھا، اسی وقت اس نے چاہا تھا کہ صبیحہ سے راہ و رسم پیدا کرے، اس پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالے اور جلد یا بدیر اسیر دام کر لے، لیکن اس وقت بھی صبیحہ نے کسی طرح کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی، بلکہ اس کی شوخی کو اپنی برجستہ جوابی سے خاموش کر دیا تھا، آج یہ شہاب یہ سوچ کر، اس ٹولی میں شامل ہوا تھا جس میں صبیحہ اور سلمیٰ تھیں کہ جس طرح بھی ہو گا، کسی نہ کسی حد تک وہ صبیحہ کو بے تکلف ہونے پر مجبور کر دے گا۔ اس کی سب سے بڑی پونجی اس کی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی تھی، اسی پر اسے ناز تھا اور اسی سے کام لے کر وہ کئی لڑکیوں کو مرعوب، اور اپنا "قائل" کر چکا تھا، اس کا خیال تھا صبیحہ بھی اس فن کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو جائے گی،

لیکن یہ اس کے اندازہ کی غلطی تھی،

صبیحہ اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے دوسری لڑکیوں سے بالکل الگ تھی، وہ اگر متاثر ہو سکتی تھی، تو کردار سے، سیرت سے، اخلاق سے، انسانیت اور شرافت سے، علمی قابلیت اور جذبۂ خدمت سے، پھکڑ پن، اور بازاری انداز کے مسخرہ پن سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ان باتوں سے وہ طبعاً بیزار اور متنفر تھی۔

وہ جب گئی تھی تو پھول کی طرح شگفتہ تھی، بلبل کی طرح چہک رہی تھی واپس آئی تو اس طرح کہ آنکھیں سرخ، چہرہ تمتمایا ہوا، پیشانی پر شکن، انداز و اطوار سے برہمی اور غضب نمایاں، پھر اس نے وہ جواب سنا جو فریز رصاحب صبیحہ نے دیا تھا، اس جواب میں کتنی تلخی، کتنی درشتی اور کتنی رکھائی تھی؟ صبیحہ یہ طرز عمل اختیار ہی نہیں کر سکتی تھی، اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی، پھر اس نے یہ دیکھا کہ اپنے ساتھیوں اور ہمجولیوں سے الگ ہو کر وہ چپ چاپ جا کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی، یہ بات بھی ان جیسی مجلس طراز لڑکی سے بعید تھی،

صفدر نے بہت دنوں سے اپنے دل کے ایک گوشہ میں صنم خانہ بنا رکھا تھا، اس صنم خانہ میں صرف ایک ہی بت تھا ———— صبیحہ اور وہ حاضر و غائب اس کی پوجا کیا کرتا تھا، اب تک اس میں اتنی جرأت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ وہ اس بت کے سامنے حال دل کہہ سکتا حرف محبت زبان پر لا سکتا، بارہا اس نے سوچا کہ آج وہ صبیحہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے گا لیکن جب ملاقات ہوئی، آنکھ سے آنکھ ملی تو زبان نے بولنے سے انکار کر دیا، دل کی دل ہی میں رہ گئی اور عرض حال کو کسی اور مناسب وقت کے لئے ملتوی کرنے پر وہ مجبور ہو گیا

عورت بڑی حساس ہوتی ہے، وہ صرف حساس ہی نہیں ہوتی، اس میں حواس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے، اس چھٹی حس سے وہ لوگوں کے دل کی زبان پڑھ لیتی ہے، کوئی اس سے محبت کرے یا نفرت،

(۴۴)

صبیحہ سلمیٰ کے ساتھ، جب واپس آئی تو پرنسپل فریزر، شاہ پور جانے کی تیاری کر رہے تھے، صرف اسی ٹولی کا انتظار تھا، جو شہاب اور صبیحہ پر مشتمل تھی، صبیحہ کے ساتھ شہاب اور اس کے ساتھیوں کو نہ دیکھ کر پرنسپل فریزر نے اس سے پوچھا،

"شہاب کہاں رہ گیا؟"

وہ ذرا تلخ لہجہ میں بولی،

"میں نہیں جانتی"

پرنسپل فریزر نے ایک نظر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر خاموش ہو گئے، صبیحہ بھی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہری، آگے ٹیکسی میں بیٹھ گئی، سلمیٰ فرخندہ سے باتوں میں لگ گئی،

صفدر نے صبیحہ کو دیکھتے ہی اندازہ کر لیا تھا کوئی بات ہوئی ہے

"ہاں ——— کچھ طبیعت گھبرا رہی تھی"

صفدر کچھ سوچتا رہا، پھر کہنے لگا

"آپ کے چہرے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے!"

صبیحہ سنبھل کر بیٹھ گئی

"میرے چہرے میں کیا بات دیکھ لی آپ نے؟"

وہ گویا ہوا:

"پریشانی، برہمی، اضطراب ——— معلوم ہوتا ہے، آپ کسی سے لڑ کر آئی ہیں، آپ کو کسی بات پر غصہ آیا ہے، کوئی بات آپ کے مزاج کے خلاف ہوئی ہے۔"

صبیحہ ہنسنے لگی!

"آپ تو اچھے خاصے جوتشی معلوم ہوتے ہیں۔"

صفدر نے کہا،

"اگر میں جوتشی ہوتا تو یہ بھی بتا دیتا، ایسا کیوں ہوا ہے، لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا، اس مرحلہ پر آ کر میرے جوتش نے ہار مان لی ہے!"

ایک خفیف سا تبسم صبیحہ کے گلاب کی پتی سے نرم و نازک اور خوبصورت ہونٹوں پر نمودار ہوا، پھر وہ کہنے لگی،

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے!"

صفدر نے اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہوئے کہا،

"ہے تو ضرور ——— لیکن آپ بتائیں گی نہیں!"

اسے عزت کی نظروں سے دیکھے، یا ہوس کی نگاہوں سے وہ فوراً پہچان لے گی، اور پہچان کر اپنا ایک طرزِ عمل بھی متعین کر لے گی، وہ پاک نہاد اور پاک سرشت ہونے کے باوجود غضب کی ہوشیار اور زیرک ہوتی ہے۔

گو صفدر نے اظہارِ الفت نہیں کیا تھا، اس نے اب تک کوئی بات بھی ایسی نہیں کی تھی، جس سے اس کے سوزِ نہاں اور غمِ نہاں کا اندازہ ہو سکتا لیکن صبیحہ کی چھٹی حس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے، لیکن اس محبت کو وہ قبول کرتی ہے یا مسترد؟ اس سے وہ واقف بھی ہے یا نہیں، اپنے طرزِ عمل سے اس بات کا اس نے کبھی پتہ نہیں چلنے دیا، جس طرح صفدر دل ہی دل میں اسے چاہتا تھا، اسی طرح صبیحہ بھی دل ہی دل میں اس کے رازِ محبت سے آشنا ہو چکی تھی،

آج صفدر نے اس کا یہ حال دیکھا تو کسی طرح ضبط نہ کر سکا، تیر کی طرح سیدھا ٹیکسی کے پاس پہنچا، گیا اس طرح تھا گویا جاتے ہی صبیحہ سے باتیں شروع کر دے گا، لیکن اس کے قریب پہنچ کر اس نے رائے بدل دی اور قریب ہی ٹہلنے لگا، صبیحہ نے اس سے کہا،

"آپ ادھر کیوں چلے آئے؟"

صفدر نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کہا،

"آپ بھی تو چلی آئیں!"

وہ مسکرانے لگی،

اور پھر وہ شوخ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی !!

دونوں اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے، کھلکھلا کر ہنس پڑے،

اب صبیحہ کی وہ کیفیت دور ہو چکی تھی! اس کی برہمی کم ہو گئی تھی، اس کے اضطراب اور خلش میں فرق آ گیا تھا۔ صفدر سے مل کر، صفدر سے باتیں کر کے وہ اس ناخوشگوار حادثہ کو جو شہاب کے ساتھ پیش آیا تھا، فراموش کر دینا چاہتی تھی، اور اس کی صورت یہی تھی کہ اس نئی اور خوشگوار گفتگو سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لیا جائے۔ اس نے صفدر سے پوچھا

"کہیئے آپ نے یہاں کے آثارِ قدیمہ کی زیارت کر لی؟"

اس نے جواب دیا،

"جی ہاں ———

ے از نقش و نگار در و دیوارِ شکستہ

آثار پدید است صنادیدِ عجم را!!

واقعی چپہ چپہ پر عبرت و عظمت کے خزانے مدفون ہیں پہلے اس سرزمین پر جہاں اس وقت ہم آپ موجود ہیں کچھ لوگ بستے تھے، وہ بھی ہماری طرح زندگی سے بھرپور تھے، ان کے سینہ میں بھی دل تھے اور یہ دل کے آرزوؤں کا نگارخانہ بھی تھے، ان کی بھی ایک تہذیب تھی، ایک معاشرت تھی، ایک سماج تھی، یہ بھی کھاتے پیتے تھے، رہتے سہتے تھے، لڑتے جھگڑتے تھے، خوش ہوتے تھے، ناچتے گاتے تھے، محفلیں سجاتے تھے، جلسے کرتے تھے، زندگی کی رنگا رنگی سے لطف اندوز ہوتے تھے، نہ جانے کب بادِ تند

وہ تیوری چڑھا کر بولی،

"کیوں نہیں بتاؤں گی؟"

صفدر نے بے ساختہ کہا،

"تو بتا دیجئے پھر"؛

صبیحہ کو بھی ہنسی آ گئی، اور صفدر بھی ہنسنے لگا،

آج پہلی مرتبہ صفدر کو یہ سعادت حاصل ہوئی تھی کہ صبیحہ نے اس سے اتنی دیر تک بات کی تھی، اور یہ گفتگو خوشگوار ماحول میں اب تک جاری تھی، اس نے اس کی کسی بات سے لطف لیا تھا، وہ مسکرائی تھی، وہ ہنسی تھی، وہ کسی حد تک بے تکلفی کے ساتھ سرگرم تکلم تھی، یہ وہ نعمت تھی جسے پا کر صفدر کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھل رہا تھا، اس کا جی چاہ رہا تھا، وہ باتیں کرتی رہے، کرتی جائے یہاں تک کہ صبح و شام کا انقلاب اپنا راستہ بدل دے، وقت کی سوئی رک جائے، زمین و آسمان کی گردش میں سکون پیدا ہو جائے —— ساری ہی زندگی اسی طرح بسر ہو جائے، اسے خاموش او متفکر دیکھ کر صبیحہ نے کہا۔

"پھر آپ سوچنے لگے کچھ"،

وہ چونک پڑا،

"نہیں کوئی خاص بات تو نہیں"!

اس نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا،

"ہے تو ضرور —— لیکن آپ بتائیں گے نہیں"!

کے ایک جھونکے نے انہیں فنا کر دیا، وہ برباد ہو گئے، تباہ ہو گئے، اور پھر منوں مٹی کے نیچے دب گئے اور ڈھائی ہزار سال بعد نئے انسان نے زمین کی تہیں کھود کر ان کی تہذیب کو، صنعت کو، تمدن کو برآمد کر لیا ———— آج سے کچھ مدت بعد ہم بھی شاید اسی طرح زیرِ زمین دفن ہو جائیں، ہماری تہذیب، تمدن، ثقافت اور حضارت سب لاکھوں من مٹی کے تلے دب جائیں، اور پھر کوئی نیا انسان پیدا ہو اور وہ ہمیں کھود کر نکالے اور کسی ہال میں کسی کمرہ میں کسی شیشہ کے بکس میں ہمارے زیور، ہمارے برتن، ہمارا تاج، ہمارے کپڑے، ہمارا سامانِ آرائش، ہماری لاشوں کے ڈھانچے جن کی کھال، جن کا گوشت، جن کی رگیں، جن کے پٹھے فنا ہو چکے ہوں گے، نمائش کے لئے ایک درسِ عبرت بنا کر رکھ دے ————

صفدر یہ باتیں کر رہا تھا اور صبیحہ گوشِ ہوش سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور نظرِ توجہ سے اُسے دیکھ رہی تھی، وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے اور صفدر کے خیالات میں، جذبات میں، تصورات میں کس درجہ یگانگت ہے

"———— میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!"

صفدر چپ ہوا تو صبیحہ نے کہا،

"بس کہہ چکے آپ؟"

وہ ایک نفسِ سرد کے ساتھ گویا ہوا۔

"ان خیالاتِ پریشان کا اظہار کب تک کروں، آپ بھی سوچ رہی

ہوں گی کہ یہ مولانا صاحب کہاں سے وعظ کہنے تشریف لے آئے ؟"
صبیحہ نے ہنستے ہوئے کہا،
"واہ اچھی تشبیہہ اپنے لئے آپ کو سوجھی ——— لیکن
آپ ان خیالات میں منفرد نہیں ہیں، خود میں بھی جب سے یہاں آئی ہوں، صرف
یہی باتیں سوچ رہی ہوں، بڑی حد تک میرے اور آپ کے خیالات ہی مشترک
نہیں ہیں، الفاظ اور طرز ادا میں بھی اشتراک ہے، !"
یہ سن کر صفدر خوش ہو گیا،
"اتفاق ہے یہ بھی، لیکن بہر حال مجھے اس اتفاق پر ناز ہے !"
یہ کہتے کہتے صفدر کچھ جھینپ سا گیا، اور ذرا کے ذرا صبیحہ کے چہرے
پر بھی سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی، لیکن بہت جلد دونوں اپنی اپنی کیفیت پر
غالب آ گئے، !

صبیحہ نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے پوچھا،
"آپ نے ایک لڑکی کی وہ لاش بھی دیکھی تھی، جو برآمد ہوئی ہے ؟"
صفدر نے جواب دیا،
"جی ہاں دیکھی تھی، !"
صبیحہ نے کہا،
"اسے دیکھ کر سلمیٰ تو ڈر گئی تھی، !"
یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی، صفدر نے دریافت کیا
"کیوں ؟ ——— کیا اسے وہ چڑیل سمجھ رہی تھی کہیں

لپٹ نہ جاتے ؟"

صبیحہ نے ہنستے ہوئے کہا،

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اس نے تو وہاں کھڑا رہنا مشکل کر دیا !"

اتنے میں سلمٰی، فرخندہ اور دوسرے لڑکے بھی آ گئے، شہاب بھی سب کے پیچھے پیچھے موجود تھا، لیکن اس کا چہرہ وفورِ غضب سے اب تک تمتما رہا تھا، سب لوگ ٹیکسیوں میں بیٹھ گئے اور وہ فراٹے بھرتی شاہ پور کے ڈاک بنگلہ کی طرف روانہ ہو گئیں!

---

(۱۵)

فرخندہ اور سلمٰی ذاتی ٹیکسی پر صفدر بھی تھا دوسری ٹیکسی میں صبیحہ اور دوسری لڑکیاں ناصر اور شہاب، تیسری ٹیکسی میں پرنسپل فریزر اور باقی ماندہ لوگ، راستہ میں چند بحث و گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا، بحث یہ تھی کہ یہ آثار قدیمہ جو برآمد ہوئے ہیں، واقعی پانچسو سال قبل مسیح کے ہیں، یا اُن کے زمانہ میں فرق ہے۔

صفدر نے بحث میں حصّہ لیتے ہوئے کہا

"میرے خیال میں اگر فرق بھی ہے تو یہی، دو چار دن سے زیادہ کا نہیں ہے؟"

فرخندہ نے صفدر کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا،

"میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں، کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

وہ بولا،

"میرا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ پانچ سو سال قبل مسیح کا یہ شہر تھا، اس سے دو چار روز اِدھر اُدھر کی غلطی ہو سکتی ہے، یعنی ممکن ہے پانچ سو سال سے دو تین روز کم بتایا گیا ہو، یا زیادہ کہہ گیا ہو!"

فرخندہ ہنسنے لگی۔

"واہ اچھی دُور کی کوڑی لائے، سبحان اللہ ——————"

پھر اس نے کار کے پچھلے شیشہ سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صبیحہ کہاں رہ گئی؟"

سلمیٰ نے بتایا،

"وہ دوسری ٹیکسی میں آ رہی ہے!"

فرخندہ نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا،

"ہاں بھئی! ہمارے ساتھ اگر بیٹھ جائیں تو توہین نہ ہو جاتی اُن کی!"

سلمیٰ ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہٹو بھی! صبیحہ اس طرح کی لڑکی نہیں ہے!"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں! وہ اس طرح کی نہیں ہے، لیکن کس طرح کی ہے یہ نہیں جانتی!"

"(ہنستے ہوئے) بڑی اچھی، بڑی شریف، بڑی نیک —————— اور بھائی بڑی خطرناک!"

"خطرناک"

"ہاں بھئی خطرناک، خدا بچائے، سوچتی ہوں تو دل دہل جاتا ہے، واقعی کمال کر دیا اُس نے تو آج!"

"اس کے بہت سے کمالات میرے علم میں ہیں، لیکن کیا خاص کمال سرزد ہوا یہ نہیں جانتی، ——————— بتاؤ نا!"

"نا بھائی ——— کچھ اور باتیں کرو!"

"گویا تم بھی صبیحہ کی طرح ہمیں اس قابل نہیں سمجھتیں کہ منہ لگاؤ!"

"نہیں یہ بات نہیں ہے ——————— لیکن چھوڑو اس ذکر کو کیا فائدہ، خواہ مخواہ بات کے بڑھانے اور پھیلانے سے!

اب تو صفدر کو بھی اشتیاق پیدا ہوا، وہ پہلے ہی سے سمجھ رہا تھا کوئی خاص بات ہوئی ضرور ہے، اب سلمیٰ کی ان مبہم باتوں سے اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی، اس نے کہا،

"بتائیے تو سہی مس سلمیٰ کوئی خاص بات ہے؟"

سلمیٰ ذرا کسمساتے ہوئے بولی،

"ہاں ہے تو خاص ہی!"

صفدر نے اصرار کیا،

"تو کہہ ڈالئے نا!"

سلمیٰ نے معذرت کی،

"میں نہیں چاہتی کہ خواہ مخواہ بات بڑھے، جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو ہی گیا!"

فرخندہ بگڑ گئی،

"اگر تم یونہی معمولی باتیں کرتی رہو گی، تو میں ٹرین روکنے کی زنجیر کھینچتی ہوں، پچاس روپے جرمانہ تم ہی کو دینا پڑے گا"

سلمیٰ ہنسنے لگی،

"میری بہن یہ ٹرین نہیں ہے ٹیکسی ہے، اس میں کوئی زنجیر نہیں ہے اور اگر کسی طرح اسے رکوا لو تو جرمانہ کا خطرہ بھی نہیں ہے؟"

صفدر کو یہ باتیں کھل رہی تھیں، وہ اصل موضوع پر جلد از جلد آجانا چاہتا تھا،

"مس سلمیٰ، تفریح پھر کسی وقت کر لیجئے گا، اس وقت تو اصل واقعہ بتایئے!"

سلمیٰ نے جیسے سر کا بوجھ اتار دیا،

"بات یہ ہوئی کہ صبیحہ نے آج شہاب صاحب کو پیٹ ڈالا — ——————،

یہ سن کر فرخندہ اور صفدر دونوں کو پسینہ آگیا، دونوں نے بیک وقت اور بیک آواز میں کہا،

"کیا —————— ؟"

سلمیٰ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا،

"ہاں بھئی ہاں، ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا شہاب صاحب کے بھولے سے رخسار پر!"

اپنے دونوں سامعین کو متحیر دیکھ کر وہ گویا ہوئی،

"بھلا اس کا حوصلہ تو دیکھو ایک سنڈے مشٹنڈے مرد دے کو بھرے مجمع میں یوں دونک کے رکھ دیا، جیسے کوئی بڑی عورت کسی بچہ کو ٹھونک دے میرا تو دہشت کے مارے برا حال تھا، لیکن اس خدا کی بندی کے جلال کا یہ عالم تھا کہ چہرے پر رعب کی وجہ سے نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی جسم تو لرز رہی تھی، اور وہ کشمیری کی طرح بھری ہوئی تھی، د خوف نہ ہو اس میں احتمال ہے اگر شہاب صاحب سکوت نہ اختیار کر لیتے تو شاید وہ دو چار چانٹے اور جڑ دیتی!"

فرخندہ نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا،

"لیکن ہوا کیا تھا؟"

سلمیٰ نے بتایا،

ایمان کی پوچھو تو غلطی شہاب صاحب ہی کی تھی جس نے حتی الامکان ضبط بھی کیا، لیکن جب معاملہ حد برداشت سے باہر ہو گیا، تو اس کا ہاتھ اٹھ گیا،"

فرخندہ نے دریافت کیا،

"لیکن شہاب نے ایسی کیا بات کہی تھی،"

سلمیٰ نے ساری داستان شروع سے آخر تک سنا دی، یہ ماجرا سنکر صفدر کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس نے کہا،

"بہت اچھا کیا مس صبیحہ نے صنف نازک کی لاج رکھ لی۔"

(۶)

ٹرین کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ کی دیر تھی، طے ہوا کہ یہ وقت ڈاک بنگلہ میں جو اسٹیشن سے قریب ہی تھا گزارا جائے، سب سے پہلے چائے کا دور چلا، اس کے بعد طلبا اور طالبات نے مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر پھر مختلف موضوعات پر بحث و گفتگو شروع کر دی،

صفدر تاک میں تھا کہ موقع ملے تو صبیحہ سے گفتگو کرے، خوش قسمتی سے یہ موقع جلد ہی مل گیا وہ کسی ٹکڑی کے ساتھ شریک نہیں ہوئی، کمرہ میں بیٹھی ایک رسالہ کی ورق گردانی کرتی رہی، صفدر اندر پہنچا، اسے دیکھ کر اس نے رسالہ بند کر دیا اور منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، صفدر نے پوچھا،

"سب لوگ تو باہر ٹہل رہے ہیں۔ آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں

سلمیٰ بڑی معصومیت کے ساتھ بولی۔

"اور شہاب صاحب نے صنفِ کرخت کی لٹیا ڈبو دی!"

سب ہنسنے لگے۔

یہ دونوں کمرہ سے باہر نکلے اور لان کے ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ گئے، صفدر نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا،

"کیا آج آپ سے اور مسٹر شہاب سے کچھ ———— "

آگے کچھ کہنے کا موقع نہ ملا، وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"میں سمجھ گئی، سلمیٰ نے ضرور کچھ کہا ہو گا!"

صفدر گویا ہوا،

"آپ کا خیال صحیح ہے، لیکن میرا خیال ہے سلمیٰ جھوٹ نہیں بولتی!"

صبیحہ نے بے پروائی سے جواب میں کہا،

بہر حال اب اس ذکر سے کیا حاصل؛ ———— شہاب صاحب نے حد سے تجاوز کیا تھا، انہیں قرار واقعی سزا مل گئی، میرا خیال ہے اب وہ ایسی جرأت نا رواسے کام نہ لیں گے!

"آپ کا یہ کارنامہ سنکر خوشی سے میری جو حالت ہوئی، بیان نہیں کر سکتا!"

"خوشی کا ہے کی،؟"

"آپ نے ثابت کر دیا کہ عورت ———— شاخ گل بھی ہے شمشیر بھی ہے وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے، اپنا بچاؤ کر سکتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دریدہ دہن لوگوں کے منہ پر تھپڑ رسید کر سکتی ہے،"

"افوہ، آپ نے تو قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا، میری شان میں، ———— میں تو ایک خاص مسئلہ پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے؛

وہ گویا ہوئی،

"یوں ہی ——— آپ کیسے ادھر آنکلے؟"

صفدر اس سوال پر سٹ پٹا گیا، کچھ جواب بن نہ آیا، کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا، صبیحہ نے اس کی یہ کیفیت محسوس کرلی، وہ مسکرانے لگی، پھر بولی:-

"آپ تو بڑی سنجیدگی سے اس سوال پر غور کرنے لگے، میں نے تو یوں ہی ایک بات پوچھی تھی!"

پہلے وہ سٹ پٹایا تھا، اب جھینپ گیا، صبیحہ اٹھ کھڑی ہوئی،

"آئیے ہم بھی ٹہلیں چل کر ذرا باہر،!"

صفدر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ——— جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں، اس نے شبہ رفع کرنے کے لئے دریافت کیا،

"کیا آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں ——— ؟"

وہ ہنستی ہوئی بولی،

"آپ کے سوا یہاں اور کون ہے ——— اور جناتوں کی نہ میں قائل ہوں، نہ شاید آپ ہیں،!"

اس طرز گفتگو نے صفدر کی ہمت افزائی کی، اس نے پہلی مرتبہ حوصلہ کر کے اس کے چہرۂ زیبا پر ایک نظر ڈالی، لیکن تاب نظارہ نہ پا کر جھکالی، پھر کہنے لگا،

"آئیے تو پھر چلیں!"

ہے ——— خیر تو میں کہنا یہ چاہتی تھی کہ باقی عہدہ داروں کا انتخاب اس روز ملتوی ہو گیا تھا !"

"ہاں مجھے معلوم ہے !"

"سکریٹری شپ کے امیدوار انور صاحب ہیں !"

"میں جانتا ہوں !"

"اور ان کے لئے بڑے زور شور سے کنولیسنگ بھی ہو رہی ہے !"

"یہ بھی میرے علم میں ہے اور غالباً وہ کامیاب بھی ہو جائیں گے ——— !"

"یہی اندیشہ مجھے بھی ہے !"

"اندیشہ کیا آپ نہیں چاہتیں کہ وہ سکریٹری ہوں ؟"

"نہیں ——— نہ بھی دوسرے شہاب صاحب ہیں، میری انکی نبھ نہ کر سکے گی، جب صدر اور سکریٹری میں نہ بنے تو یونین کا کام کیسے چل سکے گا، میں تو سوچ رہی ہوں کہ استعفا دے دوں، صدارت سے !"

"میں تو ہرگز یہ رائے نہ دوں گا کہ آپ مستعفی ہو جائیں !"

"میں آپ کی رائے کا احترام کروں گی، لیکن ایک بات آپ کو میری ماننی پڑے گی، اس عہدہ کے لئے آپ اپنی امیدواری کا اعلان کر دیجئے !"

صفدر بوکھلا گیا،

"میں ——— ؟"

—— یہ سوچ کر صفدر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، دل نے پوچھا،

"وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے؛ وہ خاص مسئلہ کیا ہے؟"

پھر دل ہی نے جواب دیا،

"پوچھ کیوں نہیں لیتے؟"

اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا،

"فرمائیے، میں سن رہا ہوں، مجھے مسرت ہے کہ آپ نے مجھے اس کا اہل سمجھا!"

صبیحہ نے ایک انداز خاص سے اُسے دیکھا، اور بولی،

"یونین کی صدارت کا انتخاب تو ہو چکا ——"

"میں آپ کو اس کامیابی پر دلی مبارکباد دے چکا ہوں!"

"جی ہاں —— اور میں نے دلی منت گذاری کے ساتھ آپ کی مبارکباد قبول بھی کر لی تھی!"

ان الفاظ نے پھر صفدر کے دل میں ایک ہلچل سی مچادی، آج اسے اپنے آپ پر اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا، اس نے بڑی مشکل سے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا،

"یہ بات مجھے آج معلوم ہوئی ہے!"

صبیحہ کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم ابھرا، وہ کہنے لگی،

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا نہ معلوم ہونا ہی اچھا ہوتا

(۷)

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی بات ہے ———— !

بڑی دیر تک صفدر کے کان میں صبیحہ کے الفاظ گونجتے رہے،

"ہاں آپ ——— میں کسی طرح کی معذرت قبول نہیں کروں گی!"

ان الفاظ میں کتنا تحکم تھا، کتنا پندار تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ کتنی اپنائیت بھی، کتنا اعتماد تھا!

آج سے پہلے تک اس نے یہ سوچنے کی ہمت بھی نہیں کی تھی کہ وہ صبیحہ سے قریب ہو سکے گا، اس سے باتیں کر سکے گا، اس سے بے تکلف ہو سکے گا، دونوں مل کر بیٹھیں گے، اور اپنایت کی باتیں کریں گے، وہ حکم دے گی، اور اس اعتماد کے ساتھ جیسے اس حکم کی تعمیل ہو کر رہے گی، یہ سوچتے، وفورِ نشاط و مسرت سے اس کے دل کی حالت غیر ہونے لگی، آج اسے اپنے اوپر ناز تھا، اپنی قسمت پر ناز تھا، اب تک وہ گردشِ ایام، گردشِ فلک، اور

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے جاتے جاتے کہا،

"ہاں آپ ———— میں کسی طرح کی معذرت قبول نہیں کروں گی!"

وہ بادِ بہاری کی طرح اٹھکیلیاں کرتی چلی گئی، اور صفدر دم بخود اپنی جگہ کھڑا رہا،!

گردش روزگار کا شاکی تھا، اب یہ شکایت بالکل رفع ہو گئی تھی، اب اسے زمانہ سے، فلک کج رفتار سے، دنیا نے دوں سے کوئی شکایت نہیں تھی،

~ تم جسے یاد رہو پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

صبیحہ کے اس التفات فراواں کے بعد ہر مصیبت آسان تھی، ہر دشواری سہل تھی نہ کوئی غم تھا، نہ فکر، نہ اندیشہ، نہ د. کا، اب تو صرف دور نشاط تھا، اور دور سرخوشی تھا، محرومی اور ناکامی کا دور ختم ہو گیا، مایوسی اور نا امیدی کی تاریکی دور ہو گئی، امید اور آرزو کی روشنی پھوٹ نکلی تمنا اور کامرانی کا سورج چمکنے لگا،

زندگی میں بارہا، سرور و مسرت کے مواقع آئے تھے، اور دل کھول کر ہنسا بھی تھا، خوش بھی ہوا تھا، نشاط و سرشاں میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا تھا، طرب بے حساب سے وہ بہرہ ور بھی ہوا تھا،

لیکن آج کی بات ہی کچھ اور تھی، !

یہ خوشی، یہ سرخوشی، یہ سرمستی، یہ کیفیت اس سے پہلے کی کیفیتوں سے بالکل الگ، یکسر مختلف تھی، وہ ایک وقتی طوفان تھا، جو آیا اور گیا، یہ بادِ مراد کا ایسا جھونکا ہے، جس سے زندگی کو شادابی ملتی ہے، تازگی عطا ہوتی ہے، رعنائی بخشی جاتی ہے۔ امنگ، ولولہ، اور حوصلہ کی تخلیق ہوتی ہے پہلی خوشیاں آج یاد بھی نہیں تھیں، لیکن التفات دوست کی نعمت ایسی نہیں تھی، جو کبھی بھی بھلائی جا سکے، یہ تو زندگی کی ساتھی تھی، زندگی کے

سانس تک اُسے کلیجہ سے لگا کر رکھنا تھا، یہ بجائے خود زندگی تھی،

انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ بیٹھا تھا کہ کہیں سے گھومتا گھامتا ناصر آ گیا، اس نے خلافِ معمول آج بہت زیادہ مضطرب و شاداں و فرحاں دیکھا، آخر پوچھ بیٹھا،

"بہت خوش نظر آ رہے ہو بھئی!"

وہ اور زیادہ خوش ہو کر بولا،

"تو تم کیوں جلے جا رہے ہو؟"

ناصر ہنسنے لگا،

"کمال کرتے ہو بھئی، ہم کیوں جلنے لگے؟ —————— لیکن ایک خبر بھی سُنی؟"

"کون سی خبر؟"

مس صبیحہ کی جنگ رستمانہ کے بارے میں؟"

"(انجان بن کر) کیا کہتے ہو یار مس صبیحہ اور جنگ؟ اور جنگ بھی رستمانہ؟ —————— یا تو پاگل خانے سے آئے ہو، یا وہاں جانے کا ارادہ ہے ؟"

"اماں تم تو ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہو؟"

"واقعی یہ مجھ سے کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ مذاق کو سنجیدگی سمجھ لوں ——————!"

"گویا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"بے شک ——— اور وہ بھی سفید جھوٹ!"

"اور اگر سچ نکلا؟"

"تو پھر تمہاری مٹھائی کھری!"

"جس سے چاہو، پوچھ لو، نہ صرف ہمارے کالج میں، بلکہ شہر کے ہر کالج میں اس واقعہ کی دھوم ہے۔ یہ بھی تو معلوم ہو؟"

"صبیحہ نے مسٹر شباب کو پیٹ دیا، جو گورنمنٹ کالج کے ایک ممتاز طالبعلم ہیں اور جو اس روز ہمارے ساتھ آثار قدیمہ کے مشاہدہ کے لئے شاہ پور گئے تھے!"

"پھر کہو گے میں ہر بات مذاق میں اڑا دیتا ہوں؛ کیا تم مجھے اتنا احمق سمجھتے ہو کہ اس دروغ بے فروغ پر یقین کر لوں گا! ——— نا بھائی کالج میں خدا کے فضل سے ایک سے ایک احمق بھرا پڑا ہے، کسی اور کو بیوقوف بناؤ جا کر!"

"اچھا اگر سلمیٰ تصدیق کر دے تو مان لو گے؟"

"یہ وعدہ تو نہیں کر سکتا کہ مان لوں گا لیکن، ہاں اگر سلمیٰ نے تصدیق کر دی، تو غور کروں گا ———!"

"تو پھر اس آدمی کا نام لو جس کی تصدیق پر ایمان لے آؤ"۔

"وہ وجود تو صرف مس صبیحہ ہی کا ہو سکتا ہے، وہ اگر تصدیق کر دیں تو بے شک مان لوں گا ——— کہو اب کیا کہتے ہو؟"

میں نے بھی آج جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا ہے ———"

"(کان پکڑ کر) نا بھائی، اور دربار میں حاضری دینے کی ہمت نہیں ہے اپنے اندر!"

"یہ کیوں جناب دروغ گو صاحب؟"

"یہ لقب قبول ہے، لیکن اگر انہوں نے ایک ہاتھ خاکسار پر بھی جما دیا، تو اسی طرح مجھے بھی ذلیل ہونا پڑے گا، جو حال شہاب صاحب کا ہے"

"شہاب صاحب کا کیا حال ہے؟"

"منہ چھپاتے چھپاتے پھر رہے ہیں!"

"یہ کیوں!"

"جدھر سے نکلتے ہیں آواز آتی ہے۔" ذرا بلانا تو مس صبیحہ کو"

———— !

صفدر کھلکھلا کر ہنس پڑا،

"تمہیں خدا کی قسم!"

"واللہ"

"اماں رہنے بھی دو!"

"یہ لو پھر وہی کفر کی باتیں شروع کر دیں تم نے؟"

"کفر کی باتیں؟"

"ہاں اور کیا، اگر حق پر ایمان نہیں لاؤ گے تو باطل کے پرستار ٹھہرو گے حق کو ماننے سے انکار کر دو گے تو کافر کہلاؤ گے!"

"اچھا یہ کفر و فسق کی باتیں چھوڑو، آج جناب شہاب کے بارے میں ایک اور بڑی دلچسپ اطلاع ملی ہے۔"

"(شاہانہ انداز کی اداکاری کرتے ہوئے) ہم سنیں گے، غلام بے دام تمہیں اجازت ہے بکو!"

"(ہنستے ہوئے) کچھ شامت آئی ہے!"

"اچھا ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں حضرت! والا!"

"تم گدھے ہو؟"

"ہم نے تمہاری اس بکواس کا بُرا تو ضرور مانا، لیکن معاف کرتے ہیں، سلسلۂ کلام جاری رکھو!"

"شہاب صاحب مجمع احباب میں بیٹھے چہک رہے تھے کسی بات پر ایک ساتھی سے کچھ چھوڑ ہو گئی، اس نے بے ساختہ کہا، تمہارا علاج تو صبیحہ کے پاس ہے، اے سنگر بیچارہ ایسا کٹا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو، گھڑوں پانی پڑ گیا عزیب پر ——— !"

"جی ہاں جیسے آپ دیکھ ہی رہے تھے،"

"اور کیا نہیں بھی!"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خبر خوب لنشر ہو چکی ہے سارے کالجوں میں؛ ———"

"اور کہا، ——— ہر طرف صبیحہ کی جرأت، اور شہاب کی رکاکت کا ذکر ہوتا ہے، بہت ذلیل اور بدنام ہو گیا اس واقعہ کے بعد

ہے!"

"لیکن ہوا کیا تھا؛ ———— صبیحہ نے کیوں پیٹا اسے؟"

بھائی وہ آتش خو اور شعلہ مزاج تو ہمیشہ سے ہے کبھی آج تک اپنے کالج میں بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتی، کسی کو منہ نہیں لگایا، راز کی بات ہے تمہیں بتاتا ہوں کان میں سن لو، اور اگر کبھی زبان پر لائے، تو گلا گھونٹ دوں گا، اور ایک بار میں نے بھی کوشش کی، وہ التفاتِ خصوصی حاصل کر لوں، لیکن اس کی نگاہِ کرم معاذ اللہ، ایسا حوصلہ پست ہوا ہے کہ پھر کیا مجال ہے، جو خواب میں بھی ایسی جرأت کا ارادہ ہو ——

"(ہنستے ہوئے) نہایت لغو قسم کے انسان ہو، واقعہ شہاب کا بیان کر رہے تھے، شروع کر دی اپنی داستان بوستان خیال ————

یہ بتاؤ شہاب صاحب کی مرمت کیوں ہوئی؟"

"بس یوں سمجھو شامت آگئی تھی، حضرت نے اپنی فقرہ بازیوں کا اسے ہدف بنایا ہے، پہلے تو چپ چاپ سنتی رہی، پھر ایک دفعہ جو ہاتھ دیا ہے گھما کر گال پر تو آج تک سوزش ہو رہی ہے، اور شاید زندگی بھر ہوتی رہے گی،

"یار یہ کارنامہ تو واقعی صبیحہ کا قابلِ داد ہے!"

"اب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ یہ رپورٹ جب ڈاکٹر شاکر کے گوش گزار ہوئی، تو وہ بھی اپنا تبسم نہ ضبط کر سکے، بھلا ڈاکٹر شاکر جیسا عالم آفندو

کرتے رہو؟"

"اس سے کیا فائدہ؟"

یہ بات اتنی بے ساختگی سے ناصر نے کی کہ صفدر ہنستے ہنستے لوٹ گیا، ! ———

کا پرستار، جب اس خالص مشفقانہ منافقہ کی تبسم سے حوصلہ افزائی کرے تو اور اس سے بڑھ کر داد کیا ہو گی؟

"بڑی غیور اور خود دار لڑکی ہے صبیحہ!"

"بے شک بے شک!"

"میرے دل میں تو اس کی عزت کئی گنا بڑھ گئی!"

"تو کیا محبت پر پابندی ہے کوئی؟"

"ہاں بھئی ہے!"

"بزدل کہیں کے!"

"مجھے اپنی اس کمزوری کا اعتراف ہے، لیکن اگر تم شیر مرد ہو تو بسم اللہ ——— ہمیں میداں، ہمیں چوگاں، ہمیں گوئے!

"میں تو جانتا بھی نہیں محبت کیا چیز ہوتی ہے، یہ نام آج ہی سنا ہے تمہاری زبان سے، لیکن اگر تم ہمت کرو تو میری تائید، تعاون، مدد، ہر چیز تمہارے ساتھ ہے!" ——— دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست ——— !

"شکریہ اس نوازش کا، لیکن میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کی یہ پیشکش مسترد کرتا ہوں!"

"لیکن آخر کیوں؟"

"نہ میرے سر میں اتنے بال ہیں نہ میرا کلّہ اتنا مضبوط ہے!"

"لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دل ہی دل میں بت کافر سے محبت

(۸)

ناصر جھینپا جھینپا سا بیٹھا تھا اور صفدر پر مسلسل ہنسی کے دورے
پڑ رہے تھے، بار بار وہ ناصر کا جملہ دہرا رہا تھا،

"اس سے کیا فائدہ!"

اور ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتا تھا، اس نے کہا،

"خدا کی قسم اس بلیغ ترین جملہ کی داد نہیں دی جا سکتی ہزار ہزار
صفحے کی سو کتابیں بھی اگر اس کی تفسیر میں لکھی جائیں تو کم ہے، لوگ کہتے
ہیں ایک اچھا شعر اپنے اندر دفتر معنی پنہاں رکھتا ہے، میں کہتا ہوں،
ہمارے ناصر کا صرف یہ ایک جملہ مستقل طور پر گنج معانی ہے!"

اتنے میں ناصر نے ہونٹ پہ انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا؛

"خاموش ———— وہ آ رہی ہے!"

صفدر نے نظر اٹھا کر دیکھا تو واقعی وہ پیکر رعنائی اسی طرف

آ رہا تھا، !

وہ خاموش ہو گیا!

ذرا دیر میں صبیحہ کمرہ میں پہنچ گئی،

"بہت قہقہے لگ رہے تھے آج صفدر صاحب!

صفدر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا

"بیٹھئے!"

وہ ایک ادائے جاں نواز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی،

"ہاں تو اس شور مسرت کا سبب کیا تھا؟"

صفدر نے ناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے،

"ان سے پوچھئے!"

ناصر نے دیکھا اس نے تو بُری طرح پھانس دیا مجھے، بگڑ گیا، کہنے لگا،

"مس صبیحہ ان کا تو دماغ چل گیا ہے، اور جب آدمی پاگل ہو جاتا ہے، تو یا روتا ہے یا ہنستا ہے!"

صبیحہ مسکرائی، اس کے آبدار دانت اس طرح نمایاں ہوئے، جیسے موتی کی لڑی،

"اوہو تو یہ قہقہے صفدر صاحب کے نہیں آپ کے تھے!"

ناصر جھینپ سا گیا صفدر پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا، ناصر نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا،

ناصر کہنے لگا،

مس صبیحہ اس نالائق کی طرف سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ ——————"

"فرمائیے کیا سوال ہے؟ ——————"

"سوال یہ ہے کہ اس طرح کیسے کام چلے گا؟"

"کس طرح؟"

"یہ حضرت تو دولہن کی طرف مانجھے میں بیٹھے رہیں گے اور ہم لوگ ان کے لئے دوڑ دھوپ کریں گے، انہیں بھی تو میدان میں آنا چاہیئے!"

"رائے تو آپ کی درست نظر آتی ہے۔!"

"ہاں صاحب، یہ بہت ضروری ہے کہ یہ خود بھی میدان میں اتریں ——————!"

"لیکن کیا کریں یہ میدان میں آ کر؟"

"ووٹرس سے ملیں، تبادلۂ خیالات کریں، اپنا پروگرام انہیں سمجھائیں ان کے شکوک اور شبہات رفع کریں، حریفِ خیال کی کمزوریوں کا پردہ فاش کریں، اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا تعارف کرائیں تب بنے گا کام!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"لیکن یہ کام صفدر صاحب سے نہیں ہو سکے گا۔"

"واہ جناب کیوں نہیں ہو سکے گا؟"

"اس لئے کہ آپ نے کہا ہے انہیں چاہیئے، کہ حریف مقابل کی کمزوریوں کا پردہ فاش کریں ——— "

"بے شک کیوں نہ کریں ؛ کیا وہ کوئی کسر اٹھا رکھے گا ؛"

"جانتی ہوں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا لیکن اس کی یہی سب سے بڑی کمزوری ہے۔"

"کیا مطلب ؛ ——— کیا کہہ گئیں آپ ؛"

"(ہنستے ہوئے) میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حریف مقابل ان کی فرضی اور نام نہاد کمزوریوں کا پول ضرور کھولے گا ؛"

"ضرور کیا قطعاً !"

"اور اگر یہ خاموش رہیں گے، اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرینگے تو یہی ان کا سب سے بڑا ڈیفنس ہوگا، یہی حریف کی سب سے بڑی کمزوری ہوگی، ہر سمجھدار آدمی سمجھ لے گا، کہ شریف کون ہے، اور چھچھورا کون !"

"اچھا صاحب (ٹھنڈی سانس لے کر) بہت اچھا۔"

"آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انہیں ہمارے صفدر صاحب کو اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا تعارف کرانا چاہیئے !"

بے شک میں نے کہا ہے اور میں اب بھی اپنی اس رائے میں کسی طرح کی ترمیم قبول کرنے پر تیار نہیں ہوں، مجھے اس مطالبہ پر اصرار ہے ؛"

"آپ کا مطالبہ درست ہے، اور آپ کا اصرار ہرگز ناروا نہیں لیکن ——————"

"لیجئے یہاں بھی آپ نے لیکن کی تیغ لگادی!"

"سنیئے تو سہی،!"

"جی سن رہا ہوں! فرمایئے آپ کی باتوں میں تو اس وقت وہ لطف آرہا ہے، جیسے عمر خیام کی رباعی، یا غزل سامنے رکھی ہو!"

یہ کہتے کہتے وہ ایک دم چونک پڑا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا،

"ارے ——————"

اور پھر اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا، وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا، اس نے کہا،

"بغیر کسی مقصد کے مس صبیحہ میں معافی چاہتا ہوں اور امید ہے آپ ضرور درگذر فرمائیں گی، درحقیقت اس وقت نہ جانے کس خیال میں تھا کہ ایسی بیہودہ بات میرے منہ سے نکل گئی، جس پر اگر آپ مجھے پیٹ بھی دیں تو قطعاً مجھے کوئی شکایت نہیں ہو گی!"

یہ باتیں ناصر نے اس سادگی اور روانی سے کہیں کہ بلا ارادہ صبیحہ ہنس پڑی، اس نے ایک تبسم جاں بستاں کے ساتھ کہا،

"میں صدق دل سے آپ کی معذرت قبول کرتی رہی ہوں"

ناصر نے فوراً جواب میں کہا،

"میں صدقِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں!"
صبیحہ کے ہونٹوں پر پھر تبسم کھیلنے لگا!

ناصر نے پوچھا

"آپ کچھ فرما رہی تھیں ان کے بارے میں!"

"ہاں ذکر تھا، صفدر صاحب کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے تعارف کا"

"جی ہاں یاد آ گیا یہی ذکر تھا، میں اس پر بضد تھا کہ انہیں یہ کام خود کرنا چاہیئے، آپ نے میری تائید کی پھر فرمایا تھا، لیکن بات یہ ہے کہ صفدر صاحب کو جب خود ہی اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا علم نہیں ہے، تو وہ ان کا تعارف کیا کرائیں گے؟

"یہ کیا کہا آپ نے؟"

"کیا آپ نے سنا نہیں؟"

"سن تو لیا   لیکن کوشش کے باوجود مدعا اور مطلب سمجھ میں نہیں آیا، ذرا صاف صاف کہیئے!"

"بہت سادہ سی بات ہے ——————

"لیکن اپنی کج فہمی کو کیا کروں، خاک سمجھ میں نہیں آیا، اسی لئے تو وضاحت طلب' رہا ہوں!"

"بات یہ ہے کہ صفدر صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اپنی فطری استعداد و صلاحیت اور ذاتی خوبیوں سے خود واقف نہیں ہوتے، یہ اپنی برائی کو سن لیں گے، اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لیں گے، لیکن

اپنی خوبیاں نہیں بیان کرسکیں گے، اپنی صلاحیتوں کا اقرار نہیں کرینگے ——— اس حالت میں بہتر یہی ہے کہ یہ ذمہ داری ان پر نہ ڈالی جاتی۔"

"چلیے مان لیا ——— لیکن سوال یہ ہے کہ پھر ہوگا کیا؟ گاڑی چلے گی کیسے؟"

"ناصر صاحب آپ تو بعض وقت بڑی سادہ لوحی کی باتیں کرتے ہیں ... جتنے مہذب الفاظ میں آپ نے مجھے بے وقوف ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا کیا ہے، اس کی شکایت نہیں کرسکتا، لیکن بات وہیں کی وہیں ہے اصل سوال یہ ہے کہ ہوگا کیا؟"

"(ہنستے ہوئے) سوال یہ نہیں ہے کہ ہوگا کیا؟ یہ ہے کہ صفدر صاحب کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا مجھے اور آپ کو علم ہے یا نہیں؟"

"ضرور ہے، بہت زیادہ ہے!"

"پھر ہم آپ کس مرض کی دوا ہیں؟"

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، چلتے چلتے اس نے دروازہ پر پہنچ کر کہا،

"یہ کام مجھے اور آپ کو کرنا چاہیئے!"

صفدر چشم حیرت سے صبیحہ کو دیکھ رہا تھا، اور ناصر پھٹی پھٹی آنکھوں سے صفدر کو ——— ایں کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بہ خواب؟

خلش

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

(۱)

ناصر نے دوستی کا حق ادا کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ انور بازی لیجا چکا تھا، اس نے اتنے منظم طور پر، انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا، اور اس کے ساتھیوں نے اس زور شور سے کنویسنگ کی تھی کہ منزل بالکل سامنے نظر آنے لگی تھی، اس کی کامیابی قطعی اور یقینی بن چکی تھی، اس طرح لڑکیوں کے حلقہ میں ریحانہ نے اپنی کنویسنگ سے ایک نئی فضا پیدا کر دی تھی، چونکہ انور کے مقابلہ میں جو لوگ تھے وہ معمولی اثر ورسوخ کے تھے، اس لئے یقین تھا کہ شکست فاش سے دوچار ہوں گے،

لیکن ناصر نے جب کمان اپنے ہاتھ میں سنبھالی، تو دفعتہً صورت حالات بالکل بدل گئی، اور انور کے مقابلہ میں صفدر کا پلّہ بھاری ہو گیا، اسی طرح لڑکیوں کے حلقہ میں گو صبیحہ نے کھلم کھلا تو کوئی کلام نہیں کیا، لیکن سلمیٰ اس کے نفس ناطقہ کی حیثیت سے مصروف عمل ہو گئی، اس نے

چند ہی روز میں بیچاری ریحانہ کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا

اس صورت حالات نے انور کو اور اس کے حمایتیوں کو سخت پریشان کر دیا، اب ہر طرف سے کوشش یہ ہونے لگی کہ صفدر بیٹھ جائے جب اس میں ناکامی ہوئی تو اس کے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈے ہونے لگے، لیکن اس فن کے ناصر صاحب بادشاہ تھے، انہوں نے مخالفین کے پروپیگنڈے کا ایسا پول کھولا کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئے !

یہ سرگرمیاں عین انتخاب کے روز تک جاری رہیں بعض مبصرین کا خیال تھا، مقابلہ بڑا سخت تھا، جو بھی کامیاب ہوگا صرف چند ہی ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو سکے گا، لیکن ایسے موقعوں پر ناصر بڑے مطمئن لہجہ میں کہتا،

"جناب یہ آپ کی غلط فہمی ہے انور صاحب کو ویسی ہی شکست نصیب ہوگی، جیسی جنرل آئزن ہاور کے مقابلہ میں میک آرتھر کو حاصل ہوئی تھی، یاد ہے کتنے دم خم سے آئے تھے، اور کس بری طرح ہارے ;

آخر وہ قیامت کی گھڑی بھی سر پر آگئی !

ووٹنگ شروع ہوئی اور تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی، جس کمرہ میں ووٹنگ ہوتی تھی، اس کے باہر دونوں امیدواروں کے حامیوں، دوستوں اور ہوا خواہوں کا جم غفیر انتخابی نتیجہ سننے کے لئے بے قرار اور منتظر کھڑا تھا،

تھوڑی دیر کے بعد بورڈ پر اعلان کر دیا گیا ۔

مسٹر صفدر ۱۱۱ ووٹ
مسٹر انور ۱۳ ووٹ

اس اعلان نے جوش و خروش کی ایک نئی لہر پیدا کر دی، جو لوگ اب تک انور کی حمایت میں کام کر رہے تھے، وہ بڑھ بڑھ کو صفدر کو مبارکباد دینے لگے، حد یہ ہے کہ رسم و روایت کے مطابق بادل نخواستہ خود انور کو آ کر صفدر سے ہاتھ ملانے اور مبارکباد دینے پر مجبور ہونا پڑا، ناصر کی مسخرگی نے اس موقعہ پر بڑی نازک صورت پیدا کر دی تھی، لیکن مشترک دوستوں کے بیچ بچاؤ سے معاملہ رفت گزشت ہو گیا،

ہوا یہ کہ جب انور صفدر کو مبارکباد دے کر اور دوسرے ایک ناکام حریف کی حیثیت سے ہاتھ ملا کر واپس آ رہا تھا، تو ناصر نے بڑی سادگی سے کہا،

"انور صاحب مجھے اس شکست فاش پر آپ سے دلی ہمدردی ہے کاش میں نے آپ کا ساتھ دیا ہوتا تو یہ روز بد آپ کو نہ دیکھنا پڑتا!"

ناصر نے پھر چھیڑا،

"کوئی مضائقہ نہیں، میں نے پڑھا ہے، دوسروں نے سنا ہے اور آپ نے تجربہ کر کے دیکھ لیا ——— گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں،

اب انور کا غصہ قابو سے باہر ہو گیا، وہ چیخا،

"شٹ اپ!"

ناصر نے اسی لب و لہجہ میں کہا،

"یو شٹ اپ!"

ناصر کے لب و لہجہ نے پھر ایک پُر لطف فضا پیدا کر دی، اور جتنے حاضرین تھے وہ بے ساختہ ہنس پڑے، اس ہنسی نے آگ پر تیل کا کام کیا اور وہ آگ بگولا نظر آنے لگا، ناصر نے اُسے چمکارتے ہوئے کہا،

خیر آئندہ سال سہی ——— یار زندہ صحبت باقی، اگر صفدر کے علاوہ کسی اور کے مقابلہ میں تم کھڑے ہوئے تو بدولت تمہاری سرپرستی کریں گے، اور تمہارے آج کے یہ اشکِ حسرت اس دن خوشی کے آنسو بن جائیں گے!"

انور گھونسہ تان کر آگے بڑھا، اگر یہ گھونسہ ناصر کی پیٹھ پر کہیں پڑ جاتا، تو واقعی اس کی خیر نہیں تھی، لیکن اس نے جھکائی دے کر ایسی ڈبکی لگائی کہ انور اپنی جھونک میں ایسا آیا کہ منہ کے بل فرش زمین پر گرا ناصر کو قہقہہ لگاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا، دوسروں نے جلدی سے انور کو اٹھایا، ایک دوست نے سمجھایا،

"کمال کرتے ہو، آج تک کسی نے بھی ناصر کی بات کا بُرا مانا ہے، وہ کسے نہیں چھیڑتا، ڈاکٹر شاکر جیسی عظیم و محبوب شخصیت تک کے سامنے تو اس کی زبان رُکتی نہیں، آپ چلے ہیں اس رند لم یزل سے لڑنے اور جھگڑنے ——— چلو آؤ!"

وہ ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا، بات دب گئی!
اور انور کی خیریت بھی اسی میں تھی کہ بات کو زیادہ طول نہ دے،
اگرچہ وہ بہت زیادہ برخود غلط آدمی تھا، لیکن صفدر کے رسوخ اور ناصر
کی ہر دلعزیزی سے ناواقف نہ تھا، کبھی کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے، جب
بات کا ٹال جانا زیادہ بلیغ ہوتا ہے،!

"اس بات پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا، اب تک!"

نہ ہنسنے لگتی، اور وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا،

آخر وہ دن آیا جس کا انتظار کیا جا رہا تھا!

قومی کالج کا ہال دلہن کی طرح سجا ہوا تھا، طلبا اور طالبات کی ٹولیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں، وہی آپس کی چہلیں، ہنسی مذاق دل لگی چھیڑ چھاڑ، دلچسپی اور تفریح کے نئے نئے پروگرام،

ہال کی رونق لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی، طلبا اور طالبات اور اساتذہ جمع ہو چکے تھے، ذکر شروع ہو چکا تھا ——— مگر صفدر کا کہیں پتہ نہیں تھا، صبیحہ گھبرائی گھبرائی ادھر ادھر ڈھونڈ رہی تھی، اس کی آنکھیں صفدر کو تلاش کر رہی تھیں لیکن دور و نزدیک کہیں اسکی جھلک نہیں دکھائی دی۔

پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ سیدھی بورڈنگ میں پہنچی بجلی کی طرح صفدر کے کمرہ میں داخل ہو گئی، یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے ہو گیا، وہ اوڑھے لپٹے بستر پر دراز ہے اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں آواز دی،

"صفدر صاحب ——— صفدر صاحب!"

اس نے کمبل منہ سے اٹھایا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا،

"ارے آپ؟"

وہ قریب آ گئی،

"کیسی طبیعت ہے؟"

"طبیعت تو ٹھیک ہے ذرا بخار آ گیا ہے۔"

(۲)

صبیحہ اور صفدر کی زندگی کا نیا دَور ریٹائرمینٹ کے انتخاب کے بعد شروع ہوا ——— لیکن غیر محسوس طور پر، یہ جانے بغیر کہ ہم نے زندگی کا ایک دَور ختم کرلیا اور دوسرے دور کی سرحد میں داخل ہو گئے،

یہ ایک عام قاعدہ تھا کہ نئے انتخاب کے بعد شاندار پیمانہ پر ایکسا ڈنر کا اہتمام کیا جاتا تھا، اس موقع پر تقریریں بھی ہوتی تھیں، جانے والے صدر کے خدمات کا اعتراف، اور آنے والے صدر کا نئی اُمیدوں کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

اس تقریب کو زیادہ سے زیادہ شاندار بنانے میں صفدر نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا، صبیحہ منع کرتی،

"آپ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟"

وہ جواب دیتا،

صبیحہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور کہا،

"ذرا نہیں کافی ہے!"

وہ کہنے لگا،

"اتر جائے گا!"

وہ بولی،

اتر تو جائے گا انشاء اللہ ——— لیکن وہاں تو ڈرامہ شروع ہونے والا ہے، آپ نہ ہونگے تو لوگ کیا کہیں گے؟"

"کہیں گے میدان چھوڑ کر بھاگ گیا!"

"اور کیا ——— پھر آپ کو تقریر بھی تو کرنا ہے!"

"تقریر تو میں نے تیار کر لی ہے (جیب سے کاغذات نکالتے ہوئے) دیکھئے یہ رہی!"

"لیکن آپ پڑھ تو نہ سکیں گے، آپ کو بیمار دیکھ کر، وہاں موجود نہ پاکر، کیا بتاؤں میرے دل کی کیا حالت ہو رہی ہے؟"

"لیکن بیماری پر بس کس کا چلتا ہے مس صبیحہ!!"

"یہ تو ٹھیک ہے ——— آپ نے کتنی محنت کی تھی اس دن کے لئے اور آپ ہی اپنی محنت کا پھل نہ چکھیں، اپنی کارگزاری کی داد نہ وصول کریں ——— کاش آپ اچھے رہتے، میں بیمار پڑ جاتی،!"

یہ کہتے کہتے صبیحہ کی آواز گلوگیر ہو گئی، صفدر اٹھ کھڑا ہوا اس نے کہا،

"لیکن میں ایسا بیمار تو نہیں ہوں کہ ڈنر میں شریک نہ ہو سکوں جلسہ میں تقریر نہ کر سکوں، ذرا سا بخار ہو گیا تھا، اب پسینہ آ گیا ہے ہیں ٹھیک ہوں، آپ چلیئے میں ابھی آیا!"

صبیحہ خوش ہو گئی،

"واقعی آ رہے ہیں آپ!"

وہ بولا،

"جی ہاں ابھی آیا!"

کسی اندیشہ سے متاثر ہو کر وہ کہنے لگی،

"لیکن بخار تو آپ کو کافی تھا، اس بد احتیاطی سے کہیں پھر نہ آ جائے تو اور لینے کے دینے پڑ یں ——————!"

صفدر ہنسنے لگا،

"اب میں اسے نہیں آنے دوں گا، پہلے تو وہ بے خبری میں آیا تھا میں دھوکا کھا گیا! اب ہوشیار ہوں، خم ٹھونک کر مقابلہ کروں گا، اور شکست دوں گا!"

صبیحہ مطمئن ہو کر چلی گئی صفدر نے اس کی گلو گیر آواز سے متاثر ہو کر یہ کہا تھا کہ اب وہ اچھا ہے، واقعہ یہ تھا کہ بخار کچھ اور بڑھ گیا تھا، لیکن وہ صبیحہ کے مایوسانہ جملے نہ برداشت کر سکا، اس نے فیصلہ کر لیا خواہ کچھ ہو جائے، ڈنر میں اور جلسہ میں شرکت کرنی ہے، آخر قوتِ ارادی بھی تو کوئی چیز ہے، بلا سے بعد میں کئی روز تک میں بستر

سے نہ اُٹھ سکوں، لیکن اِس وقت تو جو بات منہ سے نکل گئی ہے اُسے پورا کرنا ہے!"

وہ جلدی جلدی اُٹھا، کپڑے تبدیل کئے، شیو کیا، اور سخت شدید بخار کی یورش کا مقابلہ کرتا شاداں و خنداں ہال کی طرف روانہ ہو گیا جہاں صبیحہ اس کا انتظار کر رہی تھی!!

صبیحہ ——— جانِ تمنا، جانِ آرزو!

(۱۳)

یونین کی سرگرمیوں نے صبیحہ اور صفدر کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا، فرصت کا ایک لمحہ بھی میسر آجاتا تو یہ دونوں جُدا نہ رہ سکتے، لیکن اس قرب، اس اپنایت اور اس اعتماد باہمی کے باوجود دونوں کے دل اگرچہ پاس پاس دھڑکتے تھے اور یہ دھڑکن ایک دوسرے کے کان تک بھی پہنچتی تھی، لیکن زبانیں خاموش تھیں،

صفدر کی زبان پر ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں آئی تھی، جو اس کے جذباتِ محبت کی ترجمان ہو، نہ صبیحہ کے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نکلا تھا، جو اعترافِ محبت کا آئینہ دار ہو، ہاں عمل کا جہاں تک تعلق تھا، دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ رہنے پر کسی طرح قادر ہی نہیں تھے

ایک روز سلمٰی نے صبیحہ کو پکڑ لیا وہ کہنے لگی،

"جناب صبیحہ بیگم صاحبہ، آپ اب حد سے بڑھ رہی ہیں!"

صبیحہ نے اُسے مسکراتی ہوئی شریر آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا

"کیا ہوا؟ کون سی خطا سرزد ہوئی ہے مجھ سے!

بغیر کسی اونچ نیچ اور تمہید کے سلمیٰ نے کہا،

"تم محبت کرنے لگی ہو!"

یہ سن کر صبیحہ چونک پڑی، اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا لیکن جلد ہی اپنی کیفیت پر غالب آگئی، اس نے ایک دفعہ گھور کر سلمیٰ کو دیکھا، اور کہا،

"ہش" ———

سلمیٰ اپنی گرفت آسانی سے چھوڑنے والی نہ تھی،

"مجھے لال پیلی آنکھیں دکھا کر مرعوب کرنے کی کوشش نہ کیجئے، یا تو اعتراف کر لیجئے، ورنہ انکار کر دیجئے ——!"

صبیحہ نے چھیڑنے کے انداز میں پوچھا،

"اگر اعتراف کروں گی تو کیا ہوگا؟ اور اگر انکار کروں گی تو کیا کرو گی ———؟"

صبیحہ ان باتوں سے اب گھبرانے لگی تھی،

"تم کہاں کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں؛ ان سے مجھے وحشت ہوتی ہے!"

سلمیٰ نے عارفانہ انداز میں سر کو جنبش دی،

"وحشت اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اوہ تو ہونا ہی چاہیے

کچھ دنوں بعد اختلاج قلب کی شکایت بھی ہو جائے گی، اتنے زور زور سے دل دھڑکے گا کہ پاس پڑوس کے لوگوں کی نیند حرام ہو جائے گی،

صبیحہ ہنسنے لگی،

"چلو ہٹو بھی ——— خدا نہ کرے!"

سلمیٰ نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا،

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں، ایسا ہوا ہی کرتا ہے!"

صبیحہ نے بے پروائی کے ساتھ کہا،

"ہوتا ہوگا ہم کیا جانیں!"

سلمیٰ پھر اپنے مطالبہ پر آ گئی،

"میں کہتی ہوں اقرار کر دو گی تو کیا بگڑ جائے گا؟"

وہ ذرا بگڑتی ہوئی بولی،

"خواہ مخواہ کروں، یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ ——— تم کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"کر تو لیتی، لیکن مجھ بیچاری کو پوچھتا کون ہے؟"

"میں سفارش کر دوں گی!"

"پھر خود کیا کرو گی؟"

"تم سے ہمدردی!"

"رشک نہیں؛ حسد نہیں؟"

"بالکل نہیں!"

"لیکن کسی کا رازِ دل نہیں پوچھنے کا حق کیا ہے؟"

"پھر تم نے یہ بات چھیڑی کیوں تھی ———— تم نہیں جانتیں میرے دل میں صفدر صاحب کی کتنی عزت ہے، وہ کتنے اچھے آدمی ہیں ————"

"بہت اچھے آدمی ہیں بس صرف یہ بُرائی ہے کہ محبت کرتے ہیں!"

یہ کہہ کر سلمیٰ ٹھٹھا مار کر ہنسی، لیکن صبیحہ کے چہرے پر اضطراب کے آثار تھے، وہ روٹھی ہوئی، اداس اداس سی دل گرفتہ سی، چپ چاپ بیٹھی رہی،!

"اب اتنا جھوٹ بھی نہ بولو، کہ یقین نہ آئے!"

"اچھا سلمیٰ اب بکواس بند کرو، میں جاتی ہوں!"

"تم نہیں جا سکتیں، آج اس مسئلہ کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔"

"کچھ زبردستی ہے؟"

"اور کیا نہیں بھی ـــــــــــــــ بیچارے صفدر کا حال یہ ہے کہ جان سے جا رہا ہے اور آپ ہیں کہ اپنی شان میں اکڑ رہی ہیں ـــــــــــــــ کیا اپنی گردن پر ایک شریف آدمی کا خون لو گی؟"

"(پریشان ہو کر) دیکھو تم مجھے جو چاہو کہہ لو، مگر ـــــــــــــــ صفدر کے بارے میں کچھ نہ کہو ـــــــ کیوں؟"

"ہاں میرا یہی مطلب ہے!"

"اپنے کانوں کو جھٹلا دوں؟"

"تو کیا تم نے سنا ہے کچھ؟"

"اور کیا یوں ہی بے پر کی اڑا رہی ہوں؟"

"(اور زیادہ پریشان ہو کر) کیا سنا ہے؟"

"(چھیڑتے ہوئے) کیوں بتائیں؟"

"تمہیں بتانا پڑے گا سلمیٰ! ورنہ ـــــــــــــــ"

"ہاں آگے کہو! ورنہ کیا ہو گا؟"

"میں تم سے بولنا چھوڑ دوں گی، کبھی بھولے سے بھی اگر بات کروں جب کہنا!"

(۴)

سلمٰی نے خوشامد کرتے ہوئے کہا

"اچھا بھئی معاف کردو، نہیں مانتیں تو جو کچھ معلوم ہے بتائے دیتے ہیں ——— !"

جمیلہ ہمہ آمادہ ہو کر بیٹھ گئی،

"بتاؤ ———"

سلمٰی ہنسنے لگی،

"تمہارے دل میں بھی کچھ کچھ ہو رہا ہے، ورنہ کسی کا ماجرائے عشق سننے کے لئے اتنی بے قرار کیوں ہو رہی ہو ؟"

"یونہی سہی ——— لیکن تمہارے منہ سے کچھ نکلے بھی تو سہی"

"بھئی کہے تو دیتی ہوں، لیکن اگر تم نے کوئی برا اثر لیا تو اور مصیبت آجائے گی !"

صبیحہ نے اطمینان دلایا،

"کوئی بُرا اثر نہیں لوں گی، لیکن بغیر کسی تمہید کے جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کہہ ڈالو!"

سلمیٰ سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی،

"سچ مجھے تو رحم آتا ہے بیچارے پر!"

صبیحہ نے ذرا برہمی لہجہ میں کہا،

"پھر وہی تمہید۔"

سلمیٰ جیسے ڈر گئی،

"اچھا اب نہیں!"

صبیحہ منتظر ہو بیٹھی کہ سلمیٰ اب کیا کہتی ہے، لیکن اس نے کچھ کہنے کے بجائے ایک بم کا گولہ چھوڑ دیا، وہ گویا ہوئی،

"صفدر صاحب ہمارے کالج سے جا رہے ہیں ——————!"

یہ سُن کر صبیحہ چونک پڑی،

"صفدر صاحب ہمارے کالج سے جا رہے ہیں؟"

"ہاں ——————"

"لیکن کہاں؟ کیوں؟ —————— بی اے میں یہ ان کا آخری سال ہے، وہ اپنی ذہانت، قرابت، قابلیت سے اساتذہ کا دل موہ چکے ہیں۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ ٹاپ کریں گے، پھر کالج سے جانے کے کیا معنی؟!"

"پھر یہ کہ میری اقتصادیات کی کتاب گم ہو گئی میں نے اُن سے کہا، دو دن کے لئے اپنی کتاب دے دیجئے، انہوں نے کتاب دے دی' کمرہ میں کتاب لاکر اس کی ورق گردانی کرنے لگی، اسے کھولا تو ایک خط ——— "

"خط ——— ؟"

"ہاں ——— ایک دستی لفافہ، سواد خط صفدر صاحب کا، پرائے خط کا پڑھنا ہے تو بری بات، لیکن صفدر صاحب کا خط تھا جی نہ مانا، میں نے اسے پڑھ لیا، !"

"بہت اچھا کیا ——— لیکن خط میں تھا کیا ؟ یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے اخدا کی بندی ——— "

"اسی سے تو اندازہ ہوا کہ یہ حضرت مجنوں کتنی دور تک صحرائے نجد طے کر چکے ہیں !"

"(چڑکر) سلمیٰ مذاق ہر وقت اچھا نہیں لگتا، جب کام کی باتیں ہو رہی ہوں تو ذرا دیر کے لئے سنجیدہ بن جایا کرو !"

"یہ تو مشکل ہے ——— پڑھی لکھی ہو، خود ہی پڑھ لو !"

"اسی لئے تو مجھے بھی زیادہ صدمہ ہے ——— مفت میں ایک ہونہار لڑکے کا مستقبل برباد ہو رہا ہے!"

"تو آخر ہوا کیا؟"

"میں تو کچھ جانتی نہیں تھی کہ اندر اندر کیا گل کھل رہے ہیں، ہوا یہ کہ ناصر صاحب کو تو جانتی ہی ہو ایک لاأبالی آدمی ہیں!"

"ہاں خوب جانتی ہوں، یہ بھی جانتی ہوں، تمہارے ان کے درمیان رومان چل رہا ہے ——— لیکن خیر اپنا اور ان کا ذکر چھوڑ دو ——— آگے؟"

"(ہنستے ہوئے) تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے: محبت کوئی جرم تو نہیں ہے، جرم تو ہے محبت کے نام پر ہوس میں مبتلا ہونا، اور میں جانتی ہوں تم دونوں کا دامن اس طرح کی لغزشوں سے بالکل پاک ہے!"

(زیرِ لب تبسم کے ساتھ) اگر یہ بات ہے تو اس حسنِ ظن کا شکریہ، میں اپنا غصّہ واپس لیتی ہوں، ورنہ سچ کہتی ہوں، دل ہی دل میں دور غضب سے میں کانپنے لگی تھی، اور سب لوگ کہتے ہیں میرا غصّہ قہرِ آسمانی کی نشانی ہے، ایک منجم نے تو پیشین گوئی بھی کر دی ہے کہ یہ غصّہ ایک دن تمہارے ہاتھ سے کسی کو قتل کرائے گا اور پھانسی چڑھوگی!"

"کھلکھلا کر ہنستے ہوئے) بھئی سلمیٰ خدا بچائے تم سے کہہ کچھ رہی تھیں، کہنے کچھ لگیں ——— ہاں تو ناصر صاحب لاأبالی آدمی ہیں، پھر؟"

(۵)

صفدر نے اپنے خط میں ناصر کو لکھا تھا،

دوست !

"کرسمس کی چھٹیوں میں وطن واپس جا رہا ہوں، اور اب واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے، یہ پڑھ کر تمہیں یقیناً حیرت ہوگی اور ایک سی، آئی ڈی کی طرح تم یہ جاننے کی کوشش کروگے کہ ایسا احمقانہ فیصلہ میں نے کیوں کیا ہے ——— ؟

تمہیں زحمت سے بچانے کے لئے خود ہی اصل سبب بتائے دیتا ہوں پھر یہ بات بھی تو ہے کہ انتہائی لاأبالی اور وارفتہ مزاج ہونے کے باوجود تم بڑے اچھے، وفادار اور مخلص دوست ہو کم از کم میرا تجربہ تمہارے بارے میں یہی ہے، پھر اگر تمہیں ہمراز اور ہمدم نہ بناؤں گا، تو گناہ

انتخاب کس پر جا کر پڑے گی؟"

ناصر میں جا رہا ہوں اور اب کبھی واپس نہیں آؤں گا، بے شک اس طرح میرا مستقبل برباد ہو جائے گا، میرے گھر والوں نے میری اعلیٰ تعلیم سے متعلق جو امیدیں اور آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ ٹوٹ جائیں گی، میرے اساتذہ جنہیں میری قابلیت، اہلیت اور صلاحیت پر ناز ہے، مایوس ہو جائیں گے۔ انہیں صدمہ ہو گا کہ ایک جوہر قابل ہاتھ سے نکل گیا، میرے دوست ——— تمہارے سوا میرا دوست اور کون ہے۔ تم بھی افسوس کرو گے کہ ایک یار شاطر سے محروم ہو گئے ——— ان سب باتوں کا مجھے قلق ہے، صدمہ ہے، لیکن میں بھی تو مجبور ہوں

ایک عرصہ سے میرے سینہ میں آگ سلگ رہی ہے!

ایک مدت سے میرے سینہ میں طوفان مچل رہے ہیں،

نہ جانے کب سے میرے دل میں ہلچل مچی ہوئی ہے،

اب تک اس آگ کو میں دباتا رہا، ان طوفانوں سے لڑتا رہا، اس ہلچل کا مقابلہ کرتا رہا،

لیکن اب میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا ہوں!"

میں اس منزل پر پہنچ گیا ہوں جہاں اعتراف شکست کے سوا چارہ نہیں،!

مجھے اعتراف شکست میں کوئی تامل نہیں، یہ شکست میرے لئے باعث فخر ہے، اس شکست پر میں ہزار فتحمندیوں کو بے جھجک قربان کر سکتا ہوں ——— لیکن کیا میری بے بسی پر تمہیں ترس نہیں آتا، مجھ میں اعتراف شکست کی ہمت ہی نہیں ہے،!

میں ——— جس نے کبھی حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالی جس نے کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا، جس نے بڑے سے بڑے خطرہ کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی جس نے مسکرا مسکرا کر بڑے سے بڑے وار جھیل لئے، ——— اب اتنا بے بس ہوں کہ محبت کا لفظ بھی زبان پر نہیں لا سکتا، یہ تک نہیں کر سکتا کہ اعتراف شکست کروں ——— آہ میرے دوست تم نہیں جانتے میں زندگی کے کس بحرانی دور سے گذر رہا ہوں۔

نے گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
———!

تم کہو گے کہ یہ میں کیسی باتیں کرنے لگا؛

ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میرے سوز نہاں سے ناواقف ہو، اور میں اتنا مجبور ہوں کہ اپنا قلب چیر کر دکھانے

پر قادر نہیں،

میں اس سے محبت کرتا ہوں، مجھے نہیں معلوم وہ میرے جذبۂ محبت سے واقف ہو چکی ہے یا نہیں لیکن دونوں صورتیں بے کار ہیں، واقف ہو تو بھی، اور ناواقف بھی، میں نے محسوس کر لیا ہے، وہ میری محبت نہیں قبول کر سکتی،

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے؟

میری محبت بے نتیجہ اور بے سود ثابت ہوئی!

جب تک ہم ایک دوسرے سے دور تھے، محبت میں جب بھی کرتا تھا، لیکن دل میں کوئی آس پیدا نہ ہوئی تھی، دل کو بڑی حد تک یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ زمین پر رہ کر چاند کو پکڑنے کی کوشش بیکار ہے، وہ اتنی اونچی ہے کہ میں اس تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا، میں اتنا بے بس ہوں کہ وہ اپنی شاخ بلند سے اتر کر میرے پاس نہیں آ سکتی، دل اس سے محبت کرتا رہا، لیکن مایوسی نے اُسے قابو میں رکھا۔

پھر ہماری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا،
ہم دونوں کو حالات اور اتفاقات نے ایک دوسرے سے

ؔ کتنی بار آنا ادھر لطف سے
عطا پر عطا ہے، کرم پر کرم

میں اس خیال خام میں مبتلا ہو گیا کہ یہ قربت ہمارے دائمی اعتماد کا پیش خیمہ ثابت ہوگی، زندگی بھر ہم دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے وابستہ رہیں گے،

مجھے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ اس کے حساس قلب نے میرے دل کی کیفیت محسوس کر لی ہے اس کے التفات سے میں یہ نتیجہ نکالتا تھا کہ گو میں نے حرف محبت زبان پر لانے کی جرأت نہیں کی، لیکن وہ میری محبت سے واقف ہے، آشنا ہے اسے قبول کر چکی ہے،

لیکن میرے دوست!!

ؔ قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

دفعتاً مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا وہ غلط تھا، یہ میری نادانی تھی احماقت تھی،

کل ہی کا تو واقعہ ہے، یونین کے دفتر میں ہم دونوں بیٹھے تھے، نہ جانے کیوں اور کس طرح عشق و محبت کے فلسفہ پر بحث و گفتگو شروع ہو گئی، عین اس وقت جب میری تقریر رو پذیر نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی، اس کی چاند کی سی

قریب کر دیا، بہت قریب،

اس موقع پر مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس کا برتاؤ میرے ساتھ حد درجہ شریفانہ رہا، اس نے مجھ پر اعتماد کیا، اس نے میرے مشوروں کو وقعت دی، بلکہ سچ پوچھو تو خود اس نے مجھے اپنے ساتھ اشتراکِ عمل اور تعاون پر آمادہ کیا۔

جس روز اس نے محبت سے اصرار کیا تھا کہ یونین کی سکریٹری شپ کے لئے میں کھڑا ہو جاؤں، جب میرا تامل دیکھ کر اس نے تحکم کے ساتھ کہا تھا مجھے یہ کرنا پڑے گا، جب سلمیٰ کے ساتھ وہ میری خاطر کنویسنگ کے لئے نکلی، یونین کے یوم مسند نشینی پر جب وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے کمرہ تک آئی اور مجھے بخار میں مبتلا دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی، پھر جب بخار کے باوجود اسے اپنی تندرستی کا یقین دلا کر صرف اپنی قوتِ ارادی کے بل پر میں ہال میں پہنچا تو مجھے دیکھ کر اس کے چہرۂ زیبا پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، اس کا وہ جان نواز تبسم میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گا!

ناصر، اس کے اس التفات نے میرے دلِ ناداں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا اور امیدوں کے قلعے بنانے لگا، حالانکہ تھے وہ ریت کے گھروندے، اس زمانہ میں حسرت موہانی کا یہ شعر اکثر میرے ورد زبان رہتا تھا،

ع رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

کوئی ایسی ہی جگہ تلاش کروں گا، وہیں رہ پڑوں گا، جہاں کوئی نہ ہو، نہ ہمدم، نہ پاسباں، نہ دوست نہ نکتہ چیں،

—— نوحہ خواں بھی نہیں تیمار دار بھی نہیں ——

ہمدرد بھی نہیں دمساز بھی نہیں،

ے پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میرے گھر والے رو پیٹ کر صبر کرلیں گے، دوستوں میں شاید تم ہی ایک ایسے ہو، جس کے بارے میں یقین ہے کہ مجھے یاد رکھے گا رہ گئی وہ ہستی جسے میں پوجتا ہوں، جس سے محبت کرتا ہوں، جسے چاہتا ہوں، وہ مجھے کیوں یاد کرنے لگی؛

کاش کوئی مجھے یقین دلاسکتا کہ عشق اور محبت کے لفظ سے چڑنے کے باوجود، یہ میرے بارے میں جانتی ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، مجھے اس سے عشق ہے!

لیکن میں بھی کتنا احمق ہوں کہ ناممکن کی آرزو کررہا ہوں!
تمہیں یہ خط میں نے پبلسٹی کے لئے نہیں لکھا ہے، اپنا ہمدرد اور راز داں سمجھ کر لکھا ہے، جو بات میں نے صرف تم سے کی ہے وہ کسی اور کے علم میں نہ آنی چاہیئے، میں اپنا راز افشا نہیں کرنا چاہتا، مجھے اپنی بدنامی اور رسوائی کی

چمکتی پیشانی پر بل پڑ گئے، اس نے تیکھے انداز میں کہا،

"محبت! ——— مجھے تو اس لفظ سے چڑ ہے!"

میرے دوست! ان الفاظ نے میری قسمت کا فیصلہ کر دیا،!

میں نے محسوس کر لیا میں اسے نہیں پا سکتا، وہ میری نہیں بن سکتی، وہ میری محبت کسی طرح قبول نہیں کر سکتی،!

میں یکدم خاموش ہو گیا، میرا جوش تقریر سرد پڑ گیا، تھوڑی دیر کے لئے میں گونگا ہو گیا،!

اسی اثناء میں سلمیٰ آگئی، اور وہ کسی کام سے اسے اپنے ساتھ لئے ہوئے چلی گئی ——— وہ چلی گئی اور میں اپنا سر پھوڑنے کو تنہا بیٹھا رہ گیا،!

اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہاں رہنا بیکار ہے اگر یہی لیل و نہار رہے تو میرے عشق کی آگ سلگتی رہیگی اور سلگتے سلگتے ایک دن میرے قلب و روح کو جلا کر خاکستر کر دے گی، میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکوں گا، اور کسی نہ کسی دن میری زبان پر وہ لفظ آ جائے گا، جس سے اسے "چڑ" ہے یعنی عشق، یعنی محبت، ایسے اظہار عشق سے کیا، حاصل، جس کا نتیجہ ناکامی، حسرت اور تلخی کے سوا کچھ نہ ہو

میں اب چلا جاؤں گا، کہاں جاؤں گا، کچھ نہیں کہہ سکتا، بس اب دل میں یہ سمائی ہے،

(۶)

صبیحہ خط پڑھ رہی تھی، اور لمحہ بلمحہ اس کا رنگ رُخ متغیر ہوتا جا رہا تھا، کبھی سُرخ ہو جاتا، کبھی سفید پڑ جاتا، کبھی غمگین نظر آتی، کبھی مسرور، کبھی افسردگی کی جھلک دکھائی دیتی کبھی ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا،

خط پڑھ چکنے کے بعد اس نے سلمیٰ کو واپس کر دیا،

سلمیٰ نے خط واپس لے کر دریافت کیا،

"پڑھ لیا؟"

وہ بولی،

"ہاں —————— ایک ایک لفظ!"

سلمیٰ کہنے لگی

"پھر کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلہ کے!"

صبیحہ نے افسردہ لہجہ میں کہا،

پروا نہیں ہے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس کے بارے میں لوگ چرچا کریں، اس کی ذات موضوعِ بزم و انجمن بنے، وہ بڑی خوددار، غیور، اور حساس لڑکی ہے، اگر اس کے کان میں اس طرح کی کسی بات کی بھنک بھی پڑ گئی، تو نہ جانے وہ کیا کر گزرے اور میرے دوست پھر تمہاری خیریت بھی نہیں ہے، غالباً شہاب کا حسرت ناک انجام تمہیں یاد ہوگا، نہ یاد ہو تو دماغ پر زور دے کے یاد کر لو،

اچھا میرے دوست اب میں اجازت چاہتا ہوں، جی تو یہ چاہتا ہے کہ آج ہی چلا جاؤں گا، لیکن دل کا اصرار ہے کہ ایک مرتبہ اس سے اور مل لوں، کچھ دیر باتیں کر لوں، دیکھنا چاہیئے، یہ آخری آرزو بھی پوری ہوتی ہے یا نہیں؛

ے سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!

"بیٹھو بھی، میں اس وقت نہ جانے کیا سوچ رہی ہوں"
سلمیٰ نے چھیڑتے ہوئے کہا،
"تو یوں کیوں نہیں کہہ دیتیں،

؎ نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں!

———!"

صبیحہ نے اُلجھتے ہوئے کہا،

"اچھا یونہی سہی!"
سلمیٰ نے شاعرانہ طور پر اُسے دیکھتے ہوئے کہا،

"ایک بات تو بتا دے ظالم!"

"کیا پوچھنا چاہتی ہو تم؟"

"کچھ تیرا دل بھی پسیجا؟"

"لیکن وہ تو اچھے خاصے احمق معلوم ہوتے ہیں۔"

"خوب قدر کی ہے بھئی عاشقِ جانباز کی ——— صفدر صاحب اچھے خاصے احمق معلوم ہوتے ہیں؟"

"ہاں اور کیا ——— بالکل!"

"اس راز کا انکشاف کیسے ہوا تم پر؟"

"میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، انہوں نے رائی کا پہاڑ بنا لیا ———!"

"لیکن تمہیں ایسی خطرناک بات کہنے کی ضرورت کیا تھی ؟"

"بات یہ ہے کہ اس گفتگو کے دوران میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا!"

"وہ کون سا ایسا واقعہ تھا جس نے ایک آدمی کی زندگی کا فیصلہ کر دیا؟"

"مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے منہ سے ایک لفظ سُن کر اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں گے، اس گفتگو سے ایک دن پہلے میں نے ایک ناول ختم کیا تھا، بڑا دردناک ناول تھا، ایک شخص نے دیوانہ وار ایک لڑکی سے محبت کی اسے اپنی لازوال محبت کا یقین دلایا، وہ اس پر اعتماد کرنے لگی، خود بھی محبت کرنے لگی، اس کی محبت اور اعتماد سے مرد نے ناجائز فائدہ اٹھایا، اور اسے کہیں کا نہ رکھا، اس کی زندگی غارت کر دی، اسے ماں بنا کر دُنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا، نباہ کا وعدہ پورا نہ کیا، شادی کا عہد کیا اس لئے تھا کہ توڑ دے گا، اس بیچاری نے اس ظالم اور خونخوار اور بندۂ ہوس مرد سے رحم و کرم کی بھیک مانگی، لیکن اس نے نگاہِ غلط انداز سے بھی اس کی طرف نہ دیکھا، یہ بیچاری خوشامدیں کرتی، التجائیں کرتی، اپنے ہونے والے بچے کا واسطہ دیتی، سارے جتن کر ڈالے، لیکن اس سنگدل کا دل نہ پسیجا، آخر جلتے ہو انجام کیا ہوا،"

"خودکشی کر لی ہوگی بیچاری نے ،"

"ہاں سلمیٰ —————— وہ ناکام آرزو اپنی جان سے گزر گئی، اس نے خودکشی کر لی ، !"

(۷)

سلمٰی کے پاس سے اٹھ کر صبیحہ "اپنا گھر" چلی گئی، گھر سے کالج آتے وقت، اور کالج سے گھر جاتے ہوئے وہ ایک گھنٹہ آنریری طور پر ضرور صرف کرتی تھی، اس کی وجہ سے نعیم صاحب بھی ادارہ سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے، وقتاً فوقتاً اپنے اخبار میں تعریفی مضامین لکھتے رہتے تھے۔
اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ سرکاری حلقوں کے علاوہ اب دوسرے احباب ہم بھی اس کی مدد پر کمر بستہ رہتے تھے، فہمیدہ بیگم کچھ اس لئے کہ صبیحہ نعیم کی لڑکی تھی، اور کچھ اس لئے کہ اس کا جذبہ خدمت دوسروں کے لئے مشعل راہ تھا، وہ اس کی بڑی آؤ بھگت کرتی تھیں، پروین، وہی رحیمن کی لڑکی بدستور یہاں پڑھ رہی تھی، اپنی ذہانت اور محنت سے مختصر سی مدت میں اس نے نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی،
آج جب وہ کالج سے گھر جاتے ہوئے یہاں آئی، تو خلافِ معمول اس

"بڑا افسوس ہوا ——— خدا مرنے والی کو جنت الفردوس میں اور اس کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے ——— !"

"کتنی کٹھور ہو سلمیٰ تم بھی، مذاق اُڑا رہی ہو اُس کا !"

"تو اور کیا کروں ؛ ——— کیوں آگئی وہ دامِ فریب میں ؛"

"وہ عورت تھی ——— اور عورت کی فطرت اعتماد ہے، وہ جب بھی دھوکا کھاتی ہے اعتماد ہی کے باعث، اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتی ہے اور پھر مرد طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے ———

نہ جانے کیوں یہ واقعہ مجھے یاد آگیا، اور بے ساختہ میرے منہ سے وہ الفاظ نکل گئے !"

"کیا کہنا ہے آپ کی بے ساختگی کا ——— کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری ——— لیکن اب ہوگا کیا ؟

(مسکراتے ہوئے) کچھ نہیں ہوگا میں انہیں روک لوں گی، نہیں جانے دوں گی !"

"(خوش ہوکر) اس کے معنی یہ ہوتے کہ تم ——— تم ———

"(سلمیٰ کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے) تم احمق ہو !"

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور چلی گئی !

رل گئی اس کے ساتھ سلمیٰ بھی تھی، صبیحہ نے ریحانہ کو اور اس کے ساتھ سلمیٰ کو دیکھا تو سخت پریشانی ہوگئی، وہ سوچنے لگی، ضرور کوئی خاص بات ہے یہ دونوں خلافِ معمول میری تلاش میں یہاں آئی ہیں، نگاہِ تصور کے سامنے صفدر کی تصویر پھر گئی، اس نے تشویش انگیز لہجہ میں پوچھا،

"خیریت تو ہے؟"

سلمیٰ نے معذرت کرتے ہوئے کہا،

"میں تو نہیں آ رہی تھی، یہ لے آئی ہیں زبردستی ریحانہ،"

پھر وہ ریحانہ سے مخاطب ہوئی

"تم ہی کہو!"

ریحانہ نے اٹھلاتے ہوئے کہا،

"اگر تم کہہ دو گی تو کیا ہو جائے گا،"

سلمیٰ نے جواب دیا،

"بس اتنا احسان کافی ہے کہ تمہارے ساتھ چلی آئی، اس کی قائل نہیں ہوں کہ لادو ے، لدادے، چلنے والے کا ساتھ دے!"

صبیحہ نے ریحانہ سے کہا،

"بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟"

وہ گویا ہوئی،

"آج میں نے چند سہیلیوں کی دعوت کی ہے اپنے گھر پر، لیکن اگر تم شریک نہ ہوئیں تو بڑا صدمہ ہوگا مجھے!"

کا جی نہیں لگا، روز گھنٹہ بھر سے بس پانچ منٹ زیادہ ہی بیٹھتی تھی، آج بیس منٹ بھی بیٹھنا مشکل ہو گیا، فہمیدہ ایک فہیم و ذکی عورت تھی، اس نے سمجھ لیا صبیحہ کسی خاص وجہ سے پریشان ہے، اس نے کہا،

"بیٹی صبیحہ، آج تم کچھ پریشان اور مضطرب دکھائی دیتی ہو —— —— خیر تو ہے!"

صبیحہ یہ الفاظ سنکر واقعی ایسی پریشان و مضطرب ہوئی، جیسے کوئی چوری کرتے ہیں پکڑ لیا جائے اس لئے اپنی کیفیت پر غالب آتے ہوئے کہا

"جی نہیں ایسی کوئی بات تو نہیں —— ہاں سر میں درد ہو رہا ہے ذرا!"

فہمیدہ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا،

"خدا کا شکر ہے، بخار تو نہیں، یوں ہی ہونے لگا ہوگا"

"جی ہاں اور کیا، آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو گئیں!"

"میرا دل بہت کمزور ہے جس سے ذرا بھی تعلق خاطر ہوتا ہے۔ اس کی پریشانی اور تکلیف دیکھ ہی نہیں سکتی، تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے اور (سینہ پر ہاتھ رکھ کر) دیکھو میرا دل دھڑک رہا ہے!"

وہ ہنستی ہوئی بولی،

"تو پھر میں جاتی ہوں، کیونکہ اگر میرا درد سر کچھ اور بڑھا تو ضرور آپ کو اختلاج ہونے لگیگا"

فہمیدہ سے یوں باتیں بنائے وہ رخصت ہوئی، باہر نکلی تو ریحانہ

صبیحہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا،

"ضرور چلتی، لیکن سچ کہتی ہوں میرا سر درد کر رہا ہے، اسی لئے دیکھ لو آج یہاں "اپنا گھر" بھی نہیں، بیٹھی جا رہی تھی،

ریحانہ نے کہا

چلو تو سہی ہم سر دبا دیں گے"

وہ ہنستی ہوئی بولی،

"تم تو سر دبا دو گی، لیکن تمہاری سہیلیاں جو دماغ چاٹنے لگیں گی!"

"نہیں میں اس کا ذمہ لیتی ہوں —— جی نہ لگے تو ذرا دیر ٹھہر کر چلی آنا!"

صبیحہ بے بسی سے سلمیٰ کی طرف دیکھنے لگی، اس نے بھی ریحانہ کا ساتھ دیا۔

"کیا حرج ہے چلی چلو ذرا دیر کو!"

سلمیٰ کی اس ادا سے صبیحہ متاثر ہوتی کہنے لگی،

"واہ تم بھی ریحانہ کی طرف ڈھلک گئیں۔"

"خیر تم لوگ نہیں مانتیں تو چلو!"

ریحانہ خوش ہو گئی،

"آؤ، بس اب آؤ!"

سلمیٰ، صبیحہ اور ریحانہ تینوں روانہ ہو گئیں۔

دعوت واقعی بڑی پر تکلف تھی، بے تکلف سہیلیوں کے مجمع نے

لطفِ مجلس اور دوبالا کر دیا تھا جب تک صبیحہ یہاں رہی دل ذرا بہلا رہا جب گھر کی طرف روانہ ہوئی تو پھر دل خیالاتِ پریشاں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ——— اے غمِ دل کیا کروں ؛ اے وحشتِ دل کیا کروں ؛

---

(۸)

دوسرے دن صبح جب وہ کالج پہنچی تو دروازہ ہی پر صفدر سے ملاقات ہو گئی، صفدر کا چہرہ اُترا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی گہری فکر اور پریشانی میں مبتلا ہے، صبیحہ خود بڑھ کر اس سے ملی،

"میں تو کل سے آپ کی فکر میں ہوں مگر آپ کہیں نظر ہی نہیں آئے"

صفدر نے حیرت آمیز نظروں سے صبیحہ کو دیکھا،

"تعجب ہے ——————"

صبیحہ مسکرائی،

"کس بات پر؟ —————— میری جستجو پر، یا اپنے غائب ہونے پر؟ ——————"

صفدر کچھ چکرا سا گیا،

"اگر میں کہوں دونوں پر؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"آپ جھوٹ نہیں بولتے، یہ مجھے یقین ہے!"

صفدر نے لاجواب ہوتے ہوئے کہا۔

"پھر خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں؟"

اتنے میں گھنٹہ بجا، صبیحہ نے اپنی کلاس کی طرف جاتے ہوئے کہا،

"انٹرول میں، کیا آپ یونین کے دفتر تک آسکیں گے؟"

اس نے اپنی کلاس کی طرف مڑتے ہوئے کہا،

"ضرور!"

وہ جاتے جاتے بولی،

"میں آپ کا انتظار کروں گی!"

صفدر کلاس میں آکر بیٹھا اور سوچنے لگا،

"صبیحہ کی یہ گفتگو کیا معنی رکھتی ہے؟"

وہ مجھے کیوں تلاش کر رہی تھی؟

اس نے یونین کے دفتر میں مجھے کیوں بلایا ہے؟

"وہ کون سی ایسی بات ہے، جس کے لئے اتنی تاکید کی جا رہی ہے؟"

پروفیسر صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے، لہٰذا نہایت اطمینان سے لڑکے گپ شپ میں مبتلا تھے، چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری تھا، اتنے میں رفیع کی نظر صفدر پر پڑی! اس نے دیکھا حضرت عالم مراقبہ

میں بیٹھے ہوئے ہیں کہنی مار کر اس نے اپنے ایک ساتھی مشتاق سے کہا۔

"دیکھ رہے ہو؟ ——— صفدر کہیں کی سیر کر رہا ہے؟"

مشتاق نے صفدر کو ہلا ڈالا، وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا، مشتاق نے پوچھا،

"کہاں کی سیر ہو رہی ہے حضرت؟"

رفیع قریب آ کر بیٹھ گیا، اس نے کہا۔

ارے بھئی صفدر غریب کو کیوں چھیڑتے ہو، اس کا تو آج کل وہ حال ہو رہا ہے کہ،

ع ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

"کیوں بھائی صفدر ٹھیک ہے نا؟"

صفدر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"بھائی میری طبیعت خراب ہے، دق نہ کرو"

مشتاق نے کہا،

"اچھا دق نہیں کریں گے، بتاؤ کرسمس کا پروگرام کیا ہے؟ کہیں چلو گے سیر و تفریح کے لئے؟"

"جی نہیں ——— شکریہ!"

"آخر آپ پر تصوّف کا دورہ کیوں پڑ رہا ہے آج کل!
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ ماجرا کیا ہے؟"

"ماجرا کیسا؟"

"ہر وقت چپ چپ رہتے ہو، نہ کسی تفریح میں حصّہ لیتے ہو نہ دلچسپی، ہیں یا تو وہ مجلس آرائیاں تھیں کہ خدا کی پناہ، یا یہ خلوت پسندی ہے کہ کمرہ سے باہر ہی نہیں نکلتے ——— ضرور کوئی راز ہے، ورنہ یہ انقلابِ عظیم معنیٰ کیا رکھتا ہے؟"

صفدر ہنسنے لگا اُس نے کہا

"عظیم وہ سامنے پہنچا ہے، اس سے پوچھ لو!"

عظیم نے اپنا نام سُنا تو وہ بھی اُٹھ کر قریب آگیا۔

"میرا نام کیوں لیا جا رہا تھا؟"

صفدر نے کہا،

"مشتاق تمہیں گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے منع کیا، چپ رہو اگر کہیں اُس نے سن لیا کہ ایک بگڑا دل ہے نہ آؤ دیکھے گا نہ تاؤ، مزاج پرسی شروع کر دے گا!"

عظیم نے گھور کر مشتاق کو دیکھا،

"کیوں جناب؟ ——— اگر مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو گئی ہو تو بُرا نہ مانیئے گا ———"

اتنے میں پروفیسر صاحب آگئے اور بات ختم ہو گئی!

(۹)

انٹرول ہوتے ہی صبیحہ یونین کے دفتر میں پہنچ گئی۔ صفدر شاید کچھ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ صبیحہ نے اُسے دیکھا اور مسکراتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ تو مجھ سے بازی لے گئے ——— شاید مجھے دیر ہو گئی ؟"

صفدر نے افسردہ لہجہ میں کہا

"نہیں دیر تو نہیں ہوئی۔ میں ہی ذرا جلدی چلا آیا !"

"کیوں جلدی کیوں چلے آئے ؟"

"اس اندیشہ سے کہ کہیں دیر نہ ہو جائے !"

"(ہنستے ہوئے) کئی دن سے آپ کچھ افسردہ سے نظر آ رہے ہیں ؟"

"(پریشان ہو کر) جی نہیں!"

"اپنے چہرہ کی رونق اور افسردگی کا اندازہ آدمی خود تھوڑے کر سکتا ہے۔ وہ تو دوسرے ہی کرتے ہیں!"

"لیکن آپ کے سوا کسی اور نے یہ بات مجھ سے نہیں کہی!"

"انہوں نے غور نہ کیا ہوگا!"

"یہ ایسی بات صبیحہ نے کہہ دی جس کے کئی معنی نکل سکتے تھے، وہ چکرا گئی کہ اب جواب میں کیا کہے؛ اسے خاموش دیکھ کر صبیحہ نے پھر ایک نیا سوال کیا،

"آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

وہ گویا ہوا،

"عافیت اسی میں ہے مثل مشہور ہے، ایک چپ ہزار بلا ٹالتی ہے!" ————

"تو کیا خدانخواستہ آپ کسی آفت میں گرفتار ہیں؟"

"انسان کی زندگی ہے کس لئے؟"

"آفتیں سہنے کے لئے؟"

"جی ہاں آفتیں سہنا، مصیبتیں برداشت کرنا، غموں کا مقابلہ کرنا، ناکامیوں سے دوچار ہونا، محرومیوں اور حسرت نصیبیوں سے بہرہ ور ہونا ———— یہی انسان کی زندگی ہے!"

"آپ پر اس قدر قنوطیت کیوں طاری ہے؟"

شاہی قلعہ کے ایوانِ خاص میں منایا جائے —————— میری
رائے تو ہے !"

یہ کہہ کر صبیحہ اس طرح صفدر کی طرف دیکھنے لگی گویا اس سے
پوچھ رہی تھی، آپ بتایئے کیا رائے ہے آپ کی ؟

صفدر نے کہا،

"بڑی مناسب تجویز ہے —————— !"

صبیحہ خوش ہو گئی

"تو پھر اعلان کر دوں"

صفدر نے اس کیفیت کا اظہار کئے بغیر کہا،

"ضرور کر دیجئے" !

صبیحہ نے پوچھا

"سارے انتظامات آپ ہی کو کرنا پڑیں گے !"

صفدر چونک پڑا ،

"مجھے؟ —————— ؟"

وہ متعجب ہوتی ہوئی بولی ،

"آپ نہیں تو اور کسے ؟"

صفدر دل کی بات زبان پر لے آیا ،

"نہیں مس صبیحہ ، مجھے معاف کیجئے !"

صبیحہ نے پوچھا ،

"ہر شخص پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے، جس کا وہ شکار ہوتا ہے
اگر نشاط و مسرت کے اسباب مہیا ہیں تو وہ ہمیشہ خوش اور مسرور نظر
آئے گا، اگر کلفت اور حسرت کے ماحول میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے،
نہ اس کے ہونٹ کبھی تبسم سے آشنا ہوں گے نہ نشاط و مسرت سے اُسے
کوئی حصہ ملے گا! ——— اگر آپ مجھے رنجور اور ملول دیکھتی ہیں
تو اس کا سبب یہ ہے کہ میں ہوں حسرت نصیب!"

"آج تو آپ عجیب طرح کی باتیں کر رہے ہیں!"

"یہ باتیں دل میں رکھنے والی ہیں، زبان پر لانے کی نہیں، آپ
نے چھیڑ دیا تو میں نے کہہ دیا ——— آپ نے یاد دلایا
تو مجھے یاد آگیا!"

صبیحہ اب رفتہ رفتہ بالکل سنجیدہ ہوتی چلی جا رہی تھی، وہ اگرچہ
ظاہر میں ہنس رہی تھی مسکرا رہی تھی، لیکن اگر کوئی نگاہ غور سے دیکھتا تو
محسوس کر لیتا، صفدر سے زیادہ ذہنی کشمکش اور ذہنی اُلجھن میں گرفتار ہے
صفدر نے جو کیفیت اپنی بیان کی تھی، وہ درحقیقت صبیحہ کے حالات و
تاثرات کی ترجمان تھی،

صبیحہ نے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"بعض ساتھیوں کا اصرار ہے کہ کرسمس کی ایک ہفتہ کی تعطیل اس طرح
منائی جائے کہ ہر روز یونین کی طرف سے ایک تفریحی پروگرام، کبھی باغ
میں کبھی نہر پر کشتی میں، کبھی جھیل کی سطح پر، کبھی پرانی بارہ دری میں، اور

(۱۰)

صبیحہ کے ان الفاظ نے صفدر کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا کر دی، لیکن اس نے سوچا یہ خالی خولی باتیں ہیں، جس لڑکی کو محبت کے نام سے چڑ ہو وہ ایک محبت کرنے والے دل کو نہ سمجھ سکتی ہے، نہ اس کی قدر کر سکتی ہے، یہ صرف وقت گزاری کے طریقے ہیں ——— بے نتیجہ لاحاصل ——— پھر اس نے کہا،

"اگر یہ بات ہے تو میں چلا چلوں گا!"

صبیحہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی،

"واقعی ——— ؟"

صفدر نے نظر اٹھا کر صبیحہ کو دیکھا، تو درحقیقت اس کے چہرے پر ایسی رونق نظر آ رہی تھی، جیسے کسی خلاف توقع بات نے اسے مسرور کر دیا ہو، وہ گویا ہوا،

"آخر آپ اس دلچسپ پروگرام میں حصہ لینے سے کیوں کترا رہے ہیں ؟"

صفدر کو کہنا پڑا ،

"بات یہ ہے کہ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را میری طبیعت آج کل ایک عجیب طرح کے خلجان میں مبتلا ہے اگر میں شریک بھی ہوا تو دوسروں کے لئے بار خاطر بن جاؤں گا ، اور یہ میں پسند نہیں کرتا۔"

صبیحہ کہنے لگی ،

"آپ بارِ خاطر بن جائیں گے ——— ؛ نہ جانے کن لوگوں کے لئے ، ورنہ میں تو اس پروگرام میں صرف اس لئے شریک ہو رہی تھی کہ آپ بھی ہوں گے ، ———"

"میں آپ کی فلسفیانہ نکتہ سنجیاں نہیں سننا چاہتی، میں تو ایک بات جانتی ہوں انسان کی قوتِ ارادی میں بڑی طاقت ہے، وہ جو فیصلہ کر لے اسی پر عمل کر سکتا ہے، اگر کوئی یہ طے کر لے کہ غم اس کے پاس نہیں بھٹک سکے گا تو دنیا کا کوئی حادثہ بھی اس کو غمگین اور رنجیدہ نہیں کر سکتا ——————

صفدر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

"بات تو آپ نے ٹھیک کی ہے، لیکن بدقسمتی سے میں اس قوتِ ارادی سے محروم ہوں!"

جمیلہ ہنسنے لگی،

"مرد ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ —————— یہ بات تو کمزور، بے بس اور مجبور عورتوں کو زیب دے سکتی ہے، اگرچہ وہ بھی، جب اپنی قوتِ ارادی سے کام لیتی ہیں، تو وہ کچھ کر گزرتی ہیں، کہ دنیا انگشت بدنداں اور حیران و ششدر رہ جاتی ہے ——————

بہر حال یہ وقت بحث مباحثہ کا نہیں فیصلہ کا ہے، فی الحال، آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے، اب آپ دلگیر اور افسردہ نظر نہیں آئیں گے، اگر اس فیصلہ پر عمل کرنے میں دشواری پیش آئے تو پھر مجھ سے کہئے گا!"

"آپ کیا کر لیں گی؟"

"کوئی ایسی ترکیب بتاؤں گی کہ وہ دشواری رفع ہو جائے گی!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ محمود کہیں سے گھومتا گھامتا آ گیا، یہ بھی

"آپ کا فرمان کس طرح ٹالا جاسکتا ہے ؟"
صبیحہ نے ذرا اٹھلاتے ہوئے کہا،
"جیسے واقعی آپ میرے بڑے مطیع ہیں !"
صفدر نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا،
"کیا آپ کو یقین نہیں ؟"
صبیحہ آنکھیں نہ ملا سکی ، اپنی چشم سحر خیز نیچی کرلی اور پھر کہنے لگی ،
"اگر آپ یقین دلائیں گے تو کیسے یقین نہیں کروں گی ؟"
وہ بولا،
"جس طرح کہیے ——— ہر طرح حاضر ہوں"،
"فی الحال تو یہی صورت ہے کہ آپ خوش نظر آئیں ، اور ہمارے پروگرام میں حصّہ لیں !"
"پروگرام میں تو ضرور حصّہ لوں گا، لیکن خوش نظر آؤں، اس کا مطلب کیا ہوا ؟"
وہ مسکرائی،
"بس یہی کہ ہشاش بشاش دکھائی دیں ——— آپ تو اس طرح ملول و افسردہ نظر آنے لگے ہیں ، ادھر چند روز سے جیسے کوئی بہت بڑا غم پال لیا ہے آپ نے ؟"
جواب میں پھر صفدر نے کچھ کہنا چاہا ، مگر صبیحہ نے اُسے کچھ بولنے کا موقع نہ دیا - کہنے لگی،

صفدر کے حلقۂ احباب میں شریک تھا، اس نے جو اسے یہاں بیٹھا
دیکھا تو بے تکلف اندر آ گیا، اس نے کہا،

"ارے تم یہاں بیٹھے ہو، اور ہم سارے کالج میں تمہیں تلاش کر آئے،"

صفدر نے پوچھا،

"کیوں خیریت؟"

محمود نے بتایا،

"ناصر کہہ رہا تھا، آج تم وطن واپس جا رہے ہو؛ ———— کیا واقعی؟"

محمود کے اس سوال سے صفدر سٹ پٹا گیا، پہلے تو اس نے جھینپتے ہوئے صبیحہ کی طرف دیکھا پھر کہا،

"ہاں ارادہ تو تھا، لیکن شاید نہ بھی جاؤں؛"

صفدر نے سوال کیا،

"اس تذبذب کی وجہ؛ ————؟"

صفدر نے عاجز آ کر کہا،

"آخر تمہیں میرے جانے یا نہ جانے سے کیوں دلچسپی ہے؟

وہ کہنے لگا،

"اس لئے کہ میں بھی رختِ سفر باندھ رہا ہوں، تم بھی چل رہے ہو تو ساتھ ہو جاؤں گا!"

صفدر ہنسنے لگا،

"اگر جا رہا ہوتا تو بھی میری شامت نہیں آئی تھی کہ تمہارے ساتھ جاتا ——— تم ہمیشہ سے بے ٹکٹ سفر کرنے کے عادی ہو، جب پکڑے جاتے ہو اور کب نہیں پکڑے جاتے تو جیب اس کی خالی ہوتی ہے جس بدقسمت کے ساتھ آپ سفر فرما رہے ہوتے ہیں ——— نا بابا مجھے معاف کرو!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"واقعی محمود صاحب ——— صفدر صاحب سچ کہہ رہے ہیں ———،"

محمود نے بے پروائی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا،

"اگر یہ سچ کہہ رہے ہیں تو پھر آئندہ سے سچ کا نام جھوٹ رکھنا پڑے گا!"

صبیحہ کو اور زیادہ ہنسی آگئی،

"گویا آپ ہمیشہ ٹکٹ خرید کر سفر کرتے ہیں،"

محمود نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو ضروری نہیں ہے، اس کا تعلق تو حالات سے ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے بے ٹکٹ فسٹ کلاس میں سفر کرنا پڑ جاتا ہے، کبھی ایسا ہی ہوتا ہے انٹر کا ٹکٹ لے کر تھرڈ میں بیٹھ جاتا ہوں، جب انٹر کا ٹکٹ لے کر تھرڈ میں بیٹھتا ہوں تو باقی دام واپس نہیں ملتے، جب بے ٹکٹ فسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں، تو اسے حسابِ دوستاں در دل کے کھاتے میں محسوب

"بے شک، متعدد مواقع پر کم از کم سو ڈیڑھ سو روپے تو "قرض" کے نام پر تم نے مجھ سے لئے ہوں گے کبھی کوئی رقم واپس کی؟"

"کیا ضرورت تھی واپس کرنے کی؟"

"بے ڈکار لئے ہضم کر جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیا تم نے خود ہی ہر مرتبہ قرض دیتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ میں جسے قرض دیتا ہوں اس کی واپسی کی امید نہیں رکھتا، پھر بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ میں تمہیں ناامید کر دیتا!"

صفدر نے ایک قہقہہ لگایا،

"بس تو پھر جاؤ، گھر سے بندوبست کر کے آؤ ——— حالانکہ یقین ہے۔ وہاں سے بھی خالی ہاتھ آؤ گے ——— !"

"یہ کیوں بھائی ——— خدا کے لئے ایسی بددعا نہ دو!"

"گھر سے ہر مہینہ پابندی سے رقم آتی رہتی ہے، وہ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ اسے کاہے میں خرچ کیا؟"

"حساب موجود ہے؟"

"ہاں ——— میری فہرست حساب میں دو سو روپے تو بمد قرض حسنہ ایک گرم سوٹ بنانے اور کالج کی بقایا فیس ادا کرنے کے لئے تمہارے نام لکھے ہیں؟"

"(حیرت سے) میرے نام؟ میں تمہارا مقروض ہوں؟"

"بھئی اتنے گھبرائے کیوں جاتے ہو، کوئی تقاضہ تو کرے گا نہیں تم سے

کر لیتا ہوں!"

صفدر نے صبیحہ سے کہا،

"سن لیا آپ نے؟ —— بھلا کون احمق ہو گا جو ایسے شخص کے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ ہو جائے گا،؟"

نہایت سادگی کے ساتھ محمود نے کہا،

"صفدر —— "

صبیحہ ہنسنے لگی، صفدر کو بھی ہنسی آ گئی، وہ گویا ہوا،

"آخر تم جا کیوں رہے ہو؟"

محمود نے جواب دیا۔

"مجبوراً جانا پڑ رہا ہے، کئی مہینہ سے ڈائننگ ہال اور بورڈنگ اور کالج کی فیس چڑھی ہوتی ہے، اب رجسٹرار کے دفتر سے حکمنامہ آیا ہے کہ اگر کرسمس کے فوراً بعد جملہ رقم بیباق نہ کی گئی تو —— "

"نکال دیئے جاؤ گے؟"

"ہاں یہی سمجھو!"

"کل رقم کتنی ہو گی؟"

"تقریباً دو سو روپے!"

"اگر تم شریف اور ایماندار آدمی ہوتے تو یہ رقم میں تمہیں قرض دے دیتا!"

"تو کیا جناب کو میری شرافت اور ایمانداری میں شبہ ہے؟"

صبیحہ نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا

"کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟ دس روپے کی حقیر رقم کے لئے آپ سے انکار؟"

محمود نے ہاتھ بڑھا دیا،

"تو لائیے!"

صبیحہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی،

"اسی وقت؟"

"جی ہاں ———— اس وقت اگر آپ نے دس روپے دے دیئے تو کئی فائدے حاصل ہوں گے!" ———— ایک تو میرا کام نکل جائے گا، دوسرے آپ کی صداقت ثابت ہو جائے گی کہ جو کہتی ہیں وہ کرتی بھی ہیں، تیسرے صفدر صاحب کو ذلیل ہونا پڑے گا، اسے کہتے ہیں یک کرشمہ سہ کار!"

صبیحہ مسکراتی ہوئی گویا ہوئی،

"بات تو یہ آپ نے خوب سوچی، لیکن افسوس اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے ———— بہت شرمندہ ہوں!"

بے جھجک محمود نے کہا،

"شرمندگی کی کیا بات ہے، دنیا میں ایک کا دوسرے سے کام چلتا ہی ہے، اگر آپ کی نیت نیک ہے، تو صفدر سے قرض لے کر دے دیجئے، پھر بعد میں انہیں ادا کرتی رہیے گی!"

والد جب بھی یہاں آتے ہیں، تمہاری سعادت مندی سے باغ باغ ہو کر گئے ہیں وہ ہرگز مجھ پر خفا نہیں ہوں گے کہ اتنی رقم خطیر کیوں میں نے انہیں دے دی!"

"لیکن وہ دل میں کیا کہیں گے ——————؟"

"صرف یہ کہ تم جیسے شریف اور ہونہار لڑکے جب مالی دشواریوں میں مبتلا ہوں، تو ان کی مدد کرنا شرافت کا تقاضہ ہے تم سے ہمدردی کریں گے، میری فیاضی اور عالی ظرفی پر خوش ہوں گے، تمہارا کچھ بگڑیگا نہیں، مجھے بڑی آسانی سے مزید دو سو روپے مل جائیں گے، اور سارا حساب کتاب برابر ہو جائے گا!

صبیحہ نے ہنستے ہوئے کہا

"محمود صاحب دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بڑے خطرناک آدمی ہیں"!

وہ بولا،

"اطمینان رکھیے آپ سے کبھی قرض نہیں مانگوں گا"!

صفدر نے چھیڑا،

"جیسے مل ہی تو جائے گا"!

محمود نے سوال کیا،

"کیوں مس صبیحہ اگر میں کسی وقت دس روپے قرض مانگوں تو کیا آپ انکار کر دیں گی؟"

"تمہاری سفارش کون کر رہا ہے احمق ؟"

محمود نے جواب دیا۔

"تم اندھ کون ؟ ———— کیا ابھی تم نے یہ نہیں کہا ،

مس صبیحہ سے کہ کسی فقیر کو دے دیجئے — یقین کرو

کم از کم اس وقت میں فقیر ہی ہوں ، بغیر دس روپے لئے نہیں ٹلوں گا !"

صفدر نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف

پھینک دیا !"

"جاؤ غارت ہو !"

اس نے نوٹ اٹھا کر آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھائے اور

دعا دیتے ہوئے صفدر سے مخاطب ہو کر کہا ،

"خدا لڑکا دے ، نیچے جئیں ، بوڑھے ہو !"

صبیحہ ہنستے ہنستے لوٹ گئی

صبیحہ نے ہنستے ہوئے کہا،

"محمود صاحب آپ تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے! بات یہ ہے کہ میں قرض لینے کی عادی نہیں ہوں، ورنہ ضرور صفدر صاحب سے لے کر آپ کو دے دیتی!"

"لیکن اس دلیل کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا" اس نے کہا،

یہ اصول تو آپ کا بہت اچھا ہے کہ کسی سے قرض نہیں لیتیں لیکن صفدر کے بارے میں یقین کیجئے کہ نہایت شریف آدمی ہے، کیا مجال جو کبھی بھولے سے تقاضہ کرے، لہٰذا اس سے لی ہوئی رقم کو قرض سمجھنا ہی نہیں چاہیئے!"

صفدر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا،

محمود حد سے آگے نہ بڑھو اب تک تو میں ہی تمہارا ہدف تھا اب مس صبیحہ کی جیب پر ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنا لیا ہے ——————!"

پھر وہ صبیحہ سے مخاطب ہوا،

"یہ شخص قطعاً ناقابلِ اعتبار ہے، کسی فقیر کو دے دیجئے، اگر اسے ایک پیسہ نہ دیجئے!"

نہایت سنجیدگی سے محمود نے کہا،

"تمہاری تعریف کن الفاظ میں کروں میرے دوست؛ مجھ سے اتنے خفا ہو لیکن میری سفارش سے باز نہیں آتے!"

صفدر نے ذرا تلخی سے پوچھا،

کے نام سے، محبت کے لفظ سے، محبت کے ذکر سے چڑ ہو، وہ خود اس مرض میں کیسے گرفتار ہو سکتی ہے؟ وہ کسی دوسرے شخص کی محبت کس طرح قبول کر سکتی ہے؟

لیکن اگر واقعی یہی بات ہے تو پھر اس کرم فرمائی کے معنی کیا ہوئے؟ اس کا کیا مطلب تھا کہ "میں تو اس پروگرام میں صرف اس لئے شریک ہو رہی تھی کہ آپ بھی ہوں گے؟"

اس کی شرکت میرے وجود کی محتاج کیوں ہے؟

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جب میں نے شرکت پر رضامندی ظاہر کی تو وہ خوش ہو گئی، اس خوشی میں وہ بے ساختگی تھی، جو اس کے سچے ہونے کی دلیل تھی،

اس خوشی کے کیا معنی؟ میری شرکت کی خبر سنکر مسرور ہو جانے کا کیا مطلب؟

اپنے کمرہ میں صفدر خاموش بیٹھا یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ ناصر ٹپک پڑا اس نے آتے ہی پیش گوئی کی،

"خدا کی قسم تم عنقریب بیمار پڑ جاؤ گے!"

صفدر اس صدائے بے ہنگام سے چونک پڑا۔

"مبارک کیا دو یعنے آئے ہو اس بات پر کہ میں بیمار پڑ جاؤں گا؟"

ناصر نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا

"آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے کہ ہر وقت اپنے کمرہ میں بند رہتے ہو؟

(۱۱)

صبیحہ کے پاس سے صفدر اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آیا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا، دل کا بہت بڑا بوجھ اُتر گیا صبیحہ نے آج جو باتیں کی تھیں ان میں رس تھا، ان میں آس تھی، ان میں زندگی تھی، زندگی کی دعوت تھی، دل تھا کہ وفورِ مسرت سے بے قابو ہوا جا رہا تھا، وہ دل مایوس جس کی دہلیز تک آرزوؤں اور ارمانوں، تمناؤں اور حسرتوں کے آتے ہوئے پر جلتے تھے، آج آرزوؤں اور ارمانوں، تمناؤں اور حسرتوں کا نشیمن بنا ہوا تھا، جہاں کل تک مایوسی کا موسم خزاں کارفرما تھا، وہاں آج امید کی فصل بہار اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فرما تھی

یکایک اس کے دل میں خیال آیا کہیں میں خوش فہمی یا غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہوں ؟

صبیحہ کا یہ التفات، یہ لگاؤ محبت تو نہیں ہو سکتا، جسے محبت

نے کہا،

یار تم نے بڑا غلط فیصلہ کیا تھا!"

اس نے جواب دیا،

"ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں!"

"ہمارے سمجھانے سے اگر تم نے محسوس کر لیا ہوتا تو کون سا غضب ہو جاتا!"

"کاش تم میں وہ قوت اور صلاحیت ہوتی، جو دوسروں کے فیصلے بدلوا دیا کرتی ہے تم سے کیا ضد تھی، اگر تم کسی قابل ہوتے!"

یہ کہہ کر صفدر نے ایک قہقہہ لگایا، اور داد طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا،

"سچ کہنا کیسی لاجواب بات پیدا کی ہے!"

ناصر نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا،

"جواب تو ممکن ہے، لیکن خواہ مخواہ بات بڑھانے سے کیا حاصل لیکن اتنا تو بتا دو کیا گفتگو ہوئی تم سے اور صبیحہ سے؟"

صفدر نے ذرا ہنستے ہوئے کہا،

"بکواس مت کرو!"

ناصر بگڑ گیا،

"اچھا تو میں واپس جاتا ہوں، اگر میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ تم

———— اور اب تو یہاں سے جا ہی رہے ہو، اور نہ آنے کا فیصلہ بھی کر چکے ہو، یہ ذرا سی مہلت جو ہے اسے تو ہل بیٹھ کر گزار دو،

صفدر نے جواب دیا،

"میرے بھائی، میں تمہیں، یہ افسوسناک خبر سنانے پر مجبور ہوں کہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا!"

"یعنی ———— یعنی کیا ؟"

"یعنی یہ کہ اب میں نہیں جاؤں گا!"

"(خوش ہو کر) واقعی ! سچ ؟"

"ہاں بھئی، میں نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی اور فی الحال میرا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ نہیں جاؤں گا ———— !

"لیکن اس فوری تبدیلی کی وجہ بھی ضرور ہو گی !"

"ظاہر ہے ضرور ہو گی، آج تک دنیا میں کوئی کام بھی بغیر وجہ کے ہوا ہے !"

"(مسکرا کر) دونوں باتیں ممکن ہیں،"

"پھر بھی اس طرح کمرہ میں چھپے بیٹھے ہو، جیسے لوگوں کی نظر بچا کر گلے میں پھندا لگانے والے ہو ———— آؤ چلو ہمارے ساتھ!"

"چلتا ہوں ———— لیکن اس وقت کہاں جاؤ گے ؟"

"جہاں جانے کا یہ وقت ہے، ———— یعنی سینما!"

صفدر نے کوئی مزاحمت نہیں کی، ساتھ ہو لیا، راستہ میں ناصر

"ابھی تو صرف دس روپے تم نے دیئے ہیں
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز، کبھی تیس چالیس روپے نذر کر کے دیکھو اس
آدمی کی دلچسپی کا کیا عالم ہوتا ہے"

صفدر ہنسنے لگا،

"معلوم ہوتا ہے اس بات پر جلے جا رہے ہو کہ میں نے اسے دس روپے کیوں دیئے، اچھا بھئی ٹکٹ تم نہ خریدنا، یہ بارِ گراں ہم اپنے دوشِ ناتواں پر اُٹھائیں گے!

اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ کے باہمی تعلقات کچھ عجیب سے ہوتے ہیں، بے تکلفی، یار باشی، اور مجلس طرازی کا جہاں تک تعلق ہے سب ہی عام طور پر یکساں ان سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں لیتے ہیں، کھیل کے میدان میں، کلاس روم میں، بورڈنگ کے کمروں میں، ڈبیٹ کے ہال میں یہ آپس میں ملتے ہیں، ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو بناتے ہیں، ایک دوسرے سے اپنائیت، دوستی، اور ربط و تعلق کی باتیں کرتے ہیں لیکن بایں ہمہ تعلقات کی یہ عام نوعیت ہوتی ہے، اس میں پختگی اور اور گہرائی نہیں ہوتی، لیکن اس روشِ عام سے ہٹ کر جو تعلقات قائم ہوتے ہیں ان میں استحکام بھی ہوتا ہے اور گہرائی بھی،

یوں تو کالج میں ہر شخص سے صفدر کے تعلقات تھے ۔ وہ کسی کا دشمن نہیں سب کا دوست تھا، سب کے کام آتا تھا، سب کا ہمدم اور دمساز تھا ۔ لیکن ناصر سے جو تعلقات تھے وہ عام دوستی کی

مجھے اپنا معتمد اور امین سمجھو تو پھر دوستی کے یہ مظاہرے منافقت کے سوا کچھ نہیں اور مجھ میں ہر طرح کی کمزوریاں ہیں، مگر الحمد للہ میں منافق نہیں ہوں!"

صفدر نے اسے منانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"تم تو خفا ہو گئے ——— ارے خدا کے بندے، اگر تم میرے معتمد اور امین نہ ہوتے تو وہ الوداعی خط میں تمہیں کیوں لکھتا، کسی اور کو کیوں نہ اپنا مخاطب بناتا،

ناصر تقریباً مان گیا، اس نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا،

تو پھر بتا کیوں نہیں دیتے؟"

صفدر نے بتایا،

"بھائی! کچھ کچھ باتیں شروع ہوئی تھیں، اور اگر یہ کم بخت محمود نہ ٹپک پڑتا، تو ممکن ہے گفتگو ذرا فیصلہ کن قسم کی شروع ہو جاتی، لیکن اس نے آکر سارا مزا کرکرا کر دیا اور دس روپے الگ جھٹک لے گیا، اتنا بے غیرت ہے کہ فقیروں کی طرح بھیک مانگنے پر اتر آیا۔ اور جب میں نے دس روپے کا نوٹ اس کے منہ پر پھینک مارا تو فقیروں کی طرح دعا دینے لگا، اللہ بڑا کا دے، بچے جئیں، بڑی عمر پاؤ، صبیحہ کا تو ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا ——— لیکن یار ہے دلچسپ آدمی!"

ناصر نے جل کر کہا،

غمِ آرزو

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں ؛
مرے حوصلہ کی پستی ، مرے شوق کی بلندی !

●

حدود سے بہت آگے بڑھ گئے تھے ۔ ان تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ یہ دونوں دوست ایک دوسرے کے لئے سب کچھ ، بڑی سے بڑی قربانی بھی کر سکتے تھے ۔

(۱)

کرسمس کا تفریحی پروگرام، بہت کامیاب رہا،
ایک روز شاہی باغ کی سیر کا پروگرام بنا۔
باغ کیا ہے ایک چھوٹی سی دنیا ہے رنگ و بو کی، رعنائی و زیبائی کی، نسرین و نسترن کی جلوہ آرائی عجیب طرح کی بہار دکھا رہی تھی،
اتنے میں کسی نے لہک لہک کر گانا شروع کیا،

؎ پھول ہیں گلشن میں یا پریاں قطار اندر قطار؛
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن!

صفدر اور صبیحہ گلگشت کرتے ہوئے بارہ دری کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے، صفدر نے کہا،
"آپ نے یہ شعر سنا؟"
وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"ہاں سن لیا ———— بالکل حسبِ حال ہے!

'میں چلتے چلتے تھک گئی، آئیے ذرا دیر بارہ دری میں بیٹھ کر سستا لیں!"

صفدر نے بارہ دری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا،

"بالکل یہی خیال میرے دل میں بھی آیا تھا!"

دونوں آکر بارہ دری میں بیٹھ گئے۔ سامنے سنگِ مرمر کی گود میں ایک چھوٹی سی ننھی منھی نہر بہ رہی تھی، سرو کے درخت ہر دو طرف لگے ہوئے تھے آگے چل کر ایک وسیع اور کشادہ میدان میں اور بھی بہت بڑے بڑے چھتنا ور درخت، آم، شیشم، پیپل اور جامن کے سایہ دار سائبان کی طرح اپنی جگہ قائم تھے،

ان درختوں کے نیچے مختلف ٹولیاں، لڑکوں اور لڑکیوں کی الگ الگ بیٹھی مختلف قسم کے مشغلوں میں مصروف تھیں، لیکن داستان طرازی ہو رہی تھی کہیں قصہ خوانی، کہیں شعر و سخن کی محفل گرم تھی، کہیں طنز و مزاح کی طربناکیاں محلس کو زعفران زار بنائے ہوئے تھیں، کہیں گپ ہو رہی تھی، کہیں مستقبل کے پروگرام تیار کئے جا رہے تھے، کہیں ایک دوسرے کی ہسٹری شیٹ زیرِ بحث تھی، کہیں دوسرے ساتھیوں کی پرائیویٹ زندگی پر نکتہ چینیاں ہو رہی تھیں کہیں شرارت اور "ایکٹی ویوٹی" کے دلچسپ نقشے بنائے جا رہے تھے کہیں یونین کے آئندہ انتخابات کے امیدواروں پر تنقید ہو رہی تھی، ہر آدمی اپنی دھن میں مست، اپنے خیال میں غرق اور اپنی رنگ آرائیوں میں کھویا

صفدر اور صبیحہ، ان سب سے الگ بارہ دری کے ایک گوشہ میں مصروف راز و نیاز تھے،

صبیحہ نے سامنے کی طرف نظر اٹھائی اور کہا،

"کتنا دلچسپ منظر ہے، دل میں کھبا جا رہا ہے!"

صفدر نے تائید کی،

"بہت زیادہ ——— اور اُمڈی گھٹاؤں کے اس ہجوم نے تو سماں اور بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے!"

صبیحہ ہنستے ہوئے بولی،

"جی ہاں ——— کہیں خدانخواستہ بارش نہ شروع ہو جائے!"

"میں تو چاہتا ہوں کہ ہو!"

"پھر یہ سب بکھرے ہوئے لوگ بھاگ بھاگ کر یہیں جمع ہو جائیں گے تل دھرنے کی جگہ نہ ملے اس بارہ دری میں ——— اور اگر کہیں محمود صاحب بھی ہوئے، اور ضرور ہوں گے تو اور زیادہ بور کریں گے!"

اتنے میں واقعی بارش شروع ہو گئی، اور ٹڈیوں کی طرح درختوں کے نیچے بیٹھی ہوئی یہ ٹولیاں اس بارہ دری میں آ کر جمع ہو گئیں اور آن کی آن میں واقعی تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، صبیحہ نے بے بسی کے ساتھ صفدر کو دیکھتے ہوئے کہا،

"اب بتایئے؟"

"اور کیا ہے؟"

"مردوں کا کھیل مردوں کا ہنر!"

"تو آپ اپنے جوہر دکھایئے، میں نے منع تو نہیں کیا ہے!"

"واہ یہ کیا بات ہوئی، جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا، تمہارا ساتھ ہونا ضروری ہے!"

اتنے میں بارش رک گئی، اور جس تیزی سے یہ لوگ بارہ دری میں آئے تھے، اسی تیزی سے پھر کھلے ہوئے میدان میں پہنچ گئے!

صفدر نے اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا ،
"مجھے کیا معلوم تھا آپ کے منہ سے نکلی ہوئی بات قدرت فوراً
پوری کر دیتی ہے !"

صبیحہ ہنسنے لگی، پھر سامنے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی ،
"دیکھئے محمود صاحب، خراماں خراماں اسی طرف تشریف لا رہے ہیں ،
———— دس روپے کا نوٹ نکال کر ہاتھ پر رکھ لیجئے ، بغیر
لئے وہ ٹلیں گے نہیں !"

اتنے میں محمود آ گیا، اس نے صفدر سے کہا ،
"طے یہ ہوا کہ صرف لڑکیاں بارہ دری میں بیٹھیں گی !"

صبیحہ نے پوچھا ،
"اور لڑکے کہاں جائیں گے ؟ کیا کریں گے ؟"

سادگی اور معصومیت کے ساتھ محمود نے جواب دیا ۔
"لڑکوں کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ کبڈی کھیلیں گے ——
———— آؤ بھئی صفدر، میری تمہاری جوڑ کا حکم ہو چکا ہے ۔"

صفدر نے کہا،
"بکواس مت کرو ۔ میں نے کبھی کبڈی نہیں کھیلی ، یہ شہدپن کی باتیں
تمہی کو زیب دیتی ہیں ———— جاؤ اپنا کام کرو !"

محمود نے بہ ظاہر چراغ پا ہوتے ہوئے کہا ،
"عجیب بدتمیز آدمی ہو ———— کبڈی شہدپن ہے ؟"

"میرے سینہ میں نہ جانے کتنی امنگیں بندھیں، میرے دل میں نہ جانے کتنے ولولے پروان چڑھ رہے ہیں، میرا دماغ، آرزوؤں، تمناؤں اور حسرتوں کا گنجینہ بنا ہوا ہے، لیکن میں بے بس ہوں، میری امنگیں سینہ کی دیوار سے سر ٹکرا کر رہ جاتی ہیں، میرے ولولے پروان چڑھنے سے پہلے سرد ہو جاتے ہیں، میری آرزوئیں حسرتیں اور تمنائیں، اس لئے ہیں کہ ابھریں اور فوراً موت کی نیند سو جائیں"

وہ ذرا سے ذرا رکا پھر گویا ہوا،

"جس طرح اس باغ کے پھول بے بس ہیں، جس طرح اس نہر کا پانی بے بس ہے، جس طرح تمہارا جی بے بس ہے، اسی طرح میں بھی بے بس ہوں ——— کوئی کچھ نہیں کر سکتا!"

صبیحہ نے دیکھا، صفدر کے چہرے کی اس وقت عجیب کیفیت ہو رہی تھی!!

اس کی آنکھیں سرخ تھیں، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، وہ بے چین نظر آرہا تھا،

یہ کیفیت دیکھ کر وہ گھبرا گئی، اس نے کہا،

"آپ کا یہ کیا حال ہو رہا ہے!"

صفدر چونک پڑا جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، اس نے نہایت نرم اور ملائم لہجہ میں کہا،

"نہ جانے میں کیا کیا بک گیا ——— کوئی بات آپ

کے خلافِ مزاج تو میرے منہ سے نہیں نکل گئی ؟"

صبیحہ نے التفات کی نظروں سے اُسے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے پڑھتی ہوئی بولی،

"آپ کو نہیں معلوم آپ نے کیا کہا ؟"

وہ ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا گڑبڑا گیا،

"بالکل نہیں !"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے اُسے شوخ نگاہوں سے دیکھا اور بولی،

"آخر آپ تھے کہاں ؟"

وہ بھی مسکرانے لگا،

"آپ کے پاس تو بیٹھا ہوں !"

وہ کہنے لگی،

"ہاں آپ بے شک پاس بیٹھے ہیں، دیکھ رہی ہوں، لیکن آپ کا دماغ کہاں تھا ؟ آپ سیر کہاں کی کر رہے تھے ؟ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی کہیں ہوتا ہے اور اس کے خیالات کہیں !"

"ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو !"

"اب بھی آپ کو شبہ ہے ؟"

"آپ نے یقین کا نام شبہ رکھ چھوڑا ہے ؟"

"(ہنستے ہنستے) آج تو آپ خوب نکتہ چینیاں کر رہی ہیں مجھ پر"

"آپ موقع کیوں دے رہے ہیں ؟ ———— آج

آپ کی گفتگو کچھ عجیب سی تھی ۔ !"

"آپ صحیح کہتی ہیں میں خود بھی اپنے آپ کو کچھ عجیب ہی سا محسوس کرنے لگا ہوں !"

"ابھی تو آپ نے مجھے " تم " کہہ کر بار بار مخاطب کیا تھا، اب پھر "آپ " شروع کر دیا !"

"میں نے تم کہا تھا ؟"

"ہاں ——— "

"میں بہت نادم ہوں !"

"لیکن میں آپ کے اس اندازِ تخاطب سے خوش ہوئی تھی !"

"آپ کو خوشی ہوئی تھی ؟"

"ہاں ——— اس میں اپنا پن تھی !"

"تعجب ہے !"

"کس بات پر ؟"

" اپنی خوش نصیبی پر !"

"خوش نصیبی پر لوگ خوش ہوتے ہیں یا تعجب کرتے ہیں ؟"

خوش نصیبی، اگر اچانک اور خلاف توقع ہو تو حیرت ہوتی ہی چاہیئے !"

"اچانک اور خلاف توقع کیوں ؟"

"میرا خیال تھا، ہم ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دُور ہیں لیکن آج ———

"آج کیا محسوس کر رہے ہیں آپ ——— ؟"

"جیسے ہم ہمیشہ سے قریب ہی رہے ہیں! جیسے میں مغالطہ میں تھا، جیسے میں خواب دیکھ رہا تھا اور ——— ۔"

"اور اب آنکھ کھل گئی؟"

"جی ہاں، بالکل یہی!"

"آنکھ کھلنے کے بعد کیا ہوا؟"

"وہی خواب، عالمِ بیداری بن گیا ——— !"

"کچھ عرصے سے آپ بہت دل گرفتہ اور ملول و رنجیدہ نظر آ رہے ہیں؟"

"آپ کے مشاہدہ کو میں جھٹلا نہیں سکتا!"

"لیکن آخر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی ——— ؟"

"ظاہر ہے دنیا میں کوئی بات بھی بغیر وجہ اور سبب کے نہیں ہوا کرتی!"

"تو بتایئے وہ سبب؟"

"جی چاہتا ہے آپ کو ایک شعر سنا دوں!"

"معاف کیجئے مجھے شعر و شاعری سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے!"

"لیکن اگر آپ کے سوال کا جواب بھی اسی شعر میں ہو تو ——— ؟"

"سن لوں گی ——— شعر سمجھ کر نہیں، جواب سمجھ کر!"

"حسرت موہانی کا شعر ہے!"

ایک دوسرے سے قریب لیکن دُور!
ایک دوسرے سے دُور، لیکن قریب —— رگِ جاں
کے قریب! ——

، کسی کا بھی ہو، مجھے مطلب جواب سے ہے، شعر سے نہیں، جواب نثر میں ہوتا تو اچھا تھا، آپ شعر میں دینے پر مصر ہیں تو خیر وہی سہی ؛"

"تو سنیے پھر وہ کہتا ہے،

؎ ختم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مرے حوصلہ کی پستی مرے شوق کی بلندی!

———— !"

صبیحہ کا چہرہ چمکنے لگا، اس نے عجیب نظروں سے اُسے دیکھا، کچھ کہنا چاہا لیکن نہ کہہ سکی، پھول کی پنکھڑی کی طرح نرم و نازک ہونٹوں میں ذرا سی جنبش پیدا ہوئی، جیسے اب وہ کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن یہ ارتعاش بہت جلد ختم ہو گیا، وہ پھر خاموش ہو گئی، گویا کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر خلاف مصلحت سمجھ کر خاموش ہو گئی!

صفدر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بابِ سخن وا کرتا، وہ اس وقت فیصلہ کن گفتگو کر لینا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا، اپنا دل کھول کر صبیحہ کے سامنے رکھ دے، وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آنا چاہتا تھا، وہ اعترافِ محبت کرنا چاہتا تھا، اس کی زبان سے وہ اپنی قسمت کا فیصلہ سن لینا چاہتا تھا، لیکن اسے خاموش دیکھ کر وہ بھی خاموش رہنے پر مجبور ہو گیا، ہمت نہ پڑی کہ اسے ٹٹولے اس کی کتابِ دل کا مطالعہ کرے ————

دونوں پاس پاس گم صم بیٹھے ہوئے تھے۔!

(۴)

کچھ دیر تک دونوں اس طرح خاموش بیٹھے رہے پھر صفدر میں ذرا حوصلہ پیدا ہوا،

"آپ کیوں خاموش ہو گئیں ؟"

وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی،

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ؛ . . . . "

صفدر نے سمندِ ہمت پر پھر ایک تازیانہ لگایا،

"میری یہ شعر خوانی آپ کو گراں تو نہیں گزری ؟"

اس نے بہت مختصر سا جواب دیا،

"نہیں !"

صفدر نے پوچھا،

"کیا آپ میرے بارے میں بھی کبھی سوچتی ہیں ؟"

صبیحہ کا جواب پہلے کی طرح مختصر لیکن چونکا دینے والا تھا۔

"اکثر ——————"

صفدر نے بے تابی کے عالم میں دریافت کیا،

"میرے کان دھوکا تو نہیں دے رہے ہیں؟"

وہ زیرِ لب تبسم کے ساتھ گویا ہوئی،

"آپ کا اور کانوں کا جھگڑا پرائیویٹ ہے، میں اس میں دخل دینے والی کون؟"

صفدر کی بے قراری اب کچھ اور بڑھ چکی تھی،

"کیا واقعی ——————"

وہ خاموش ہو گیا، ذرا دیر کے بعد پھر یہی الفاظ اس کے منہ سے نکلے

"کیا واقعی ——————"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، کیا آپ سن سکیں گی؟"

"ضرور سنوں گی، شوق کے کانوں سے سنوں گی!"

"آپ سے کچھ پوچھنا بھی چاہتا ہوں"

"تو پوچھتے کیوں نہیں؟"

"تم نے ابھی پوچھا تھا، میں دل گرفتہ اور ملول کیوں ہوں!"

"ہاں مجھے اس کی بڑی فکر ہے —————— بتائیے!"

"اس لئے کہ میں تم سے مایوس ہو چکا تھا ——— "

"مجھ سے مایوس ہو چکے تھے ؟"

"ہاں صبیحہ تم سے ؟"

"لیکن مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میرے آپ کے مابین کبھی کوئی ایسی بات چیت ہوئی ہو جس نے آپ کو مایوس کر دیا ہو !"

ہاں کسی طرح کی گفتگو تو نہیں ہوئی ، لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں مایوس ہو گیا تھا ، میں نے یہ کالج چھوڑ دینے کا ، اور یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا ——— "

"آخر کیوں ؟ کس لئے ؟ کیا وجہ تھی اس فیصلہ کی ؟"

"اس فیصلہ کا سبب وہ لفظ تھا ، جس نے میری روح پر قبضہ کر لیا تھا ، جس نے میرا سکون چھین لیا تھا ، جس نے مجھے اختر شماری اور شب بیداری پر مجبور کر دیا تھا ، جس نے میرے دل میں آگ بھڑکا دی تھی ، جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا ——— "

"لیکن وہ کون سا لفظ تھا ؟"

"جس سے تمہیں چڑ ہے ——— محبت !"

"آپ بالکل غلط سمجھے ——— انسان پر مختلف تاثرات طاری ہوتے ہیں ، ایسے واقعات پیش آتے ہیں ، جن سے وقتی طور پر وہ کوئی رائے قائم کر لیتا ہے ، مجھے نہیں یاد ، میں نے کیوں کہا تھا ، اس لفظ سے مجھے چڑ ہے ، کوئی خاص واقعہ کوئی خاص بات ہو گی ، کچھ دھندلا سا

خیال آتا ہے، کسی بے وفا مرد کی داستان ہوس کسی مظلوم اور سادہ لوح عورت کا افسانۂ بیچارگی کسی ناول میں پڑھا ہوگا، شاید اسی لئے یہ لفظ میرے منہ سے نکل گیا ہوگا، جب محبت جیسے پاک اور لطیف جذبہ کو ہوس، اور خود غرضی اور نفسانیت کے زیر اثر بدنام کیا جائے تو ہر شخص کو اس سے چڑنا ہی چاہیئے اگر آپ اس طرح کا کوئی واقعہ پڑھیں تو غصہ نہیں آئے گا؟"

"ضرور آئے گا!"

"پھر آپ نے اتنا اثر کیوں لیا؟"

"روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں؟"

یہ الفاظ سنکر صبیحہ کا رنگ رُخ پھر بدل گیا، وہ دامن کو نہ پکڑ کر بار بار گرہ باندھتی اور پھر کھول دیتی!!

ہوگئی۔ صفدر نے اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی، شادیٔ مرگ میں مبتلا ہوتے ہوتے رہ گئی، اس نے لرزتے ہوئے جی سے کہا،

"یہ میں کیا سُن رہا ہوں ؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"جو میں کہہ رہی ہوں !"

صفدر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں ؟"

صبیحہ نے ذرا تیکھے لہجہ میں کہا،

"یہ تو واقعی بڑا ٹیڑھا سوال ہے !"

صفدر ہنسنے لگا، پھر یکایک سنجیدہ ہو کر اس نے کہا،

"آپ کے دل میں میری جگہ ہے، آپ میری قدر و قیمت محسوس کرتی ہیں یہ سب باتیں میرے لئے بڑی دل خوش کن ہیں، اس سے بڑھ کر میرے لئے مسرت بخش بات کوئی نہیں ہو سکتی، لیکن جب اپنے آپ پر غور کرتا ہوں، اپنے حالات کا جائزہ لیتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کچھ یہ ناممکن سی بات ہے !"

"یہی تو پوچھتی ہوں، کیوں ؟" اور شاید آپ طے کر چکے ہیں کہ نہیں بتائیں گے !"

"اس لئے کہ جانتا ہوں میں کیا ہوں ؟"

"کیا ہیں آپ ؟"

(۴)

ذرا دیر کے بعد صبیحہ نے اپنی مشغولیت جاری رکھتے ہوئے پوچھا،
"لیکن یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا کہ کوئی آپ کو رُلا سکتا ہے؛"
قبل اس کے کہ صفدر کوئی جواب دے، صبیحہ نے خود ہی کہا،
"ایسا کون بدبخت ہوگا جو آپ کا دل دکھانے کی کوشش کرے!"
صفدر نے کچھ کہنا چاہا، لیکن صبیحہ کے الفاظ اس کے کان میں آئے،
"آپ کو خود اپنی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں، ہمارے کالج میں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہیں بھی آپ جیسے کردار اور سیرت کے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈنے جائیں تب بھی نہیں ملیں گے ———— مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے بارے میں آپ نے ایسی غلط رائے قائم کی، میرے دل میں، آپ کی جو جگہ ہے، اسے میں ہی جانتی ہوں!!"
یہ کہتے کہتے شرم کی سُرخی اس کے چہرہ پر نمایاں ہوئی، اور وہ خاموش

صفدر نے ٹوٹی ہوئی ہمت کا دامن پکڑا اور ایک ہی سانس میں، ایک ہی لفظ میں ماجرائے دل بیان کر دیا، اس نے کہا۔

"میں آپ سے محبت کرتا ہوں!"

یہ سنکر صبیحہ کی لویں سرخ ہو گئیں، اب تک وہ صفدر سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کر رہی تھی، اب اس کی چشم بے باک، چشم شرمگیں بن گئی، وہ بت کی طرح خاموش، اور تصویر کی طرح چپ کھڑی تھی،

صفدر اس سے جواب حاصل کرنا چاہتا تھا، اس نے کہا،

"کیا میرے اس سوال کا آپ کے پاس کوئی جواب ہے؟"

بہت صاف اور سیدھا جواب ہونا چاہیئے، یا ٹھکرا دیجئے، یا قبول کر لیجئے!"

صبیحہ نے کہا،

"پہلی بات تو ناممکن ہے"

پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور دروازے سے باہر نکل گئی!

صفدر ہکا بکا کھڑا رہ گیا،

"جو کسی کے کام نہ آ سکے ہیں وہ ایک مشتِ غبار ہوں "

"نہ جانے کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں آپ!"

"جو کہنا چاہتا تھا وہ بات تو اب تک زبان پر آ ہی نہیں سکی،!"

"کب آئے گی ؟"

"جب آپ اجازت دیں !" ——— لیکن اب میں ضبط نہیں کر سکتا، کیوں نہ آج کھل کر گفتگو کر لوں ؟

لیکن مجھے اندیشہ ہے آپ کا ارادہ پھر متزلزل ہو جائے گا، سارا وقت صرف تمہید کی نذر ہو جائے گا، ایسا معلوم ہوتا ہے، کوئی ایسی بات آپ کے ذہن میں گردش کر رہی ہے جو مناسب ہے، اس صورت میں ظاہر ہے، نہ میں آپ کو مجبور کر سکتی ہوں، اور نہ یہ مناسب ہے کہ آپ اسے زبان پر لائیں !"

یہ کہتے کہتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، جیسے اب رخصت ہوا چاہتی ہے صفدر نے محسوس کیا، قدرت آج مہربان تھی جو آغا نادر موقع عرضِ حال کا مل گیا، اگر آج بھی حرفِ مطلب زبان پر نہ آیا، تو پھر یہ موقع کبھی نہیں مل سکے گا،

دفعتاً وہ بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا،

"ایک بات سُن لیجئے !"

صبیحہ جاتے جاتے ٹھٹکی اور کھڑے کھڑے اس نے کہا،

کہئے سُن رہی ہوں

"ہاں یار ہمیں بھیجا گیا ہے!"

صفدر نے پوچھا،

"کس نے بھیجا ہے؟" ——— اور کسی نے بھی بھیجا ہو میں کسی کا بندۂ فرمان تو نہیں ہوں، جاؤ کہدو، میں نہیں آتا، نہیں آؤنگا!"

ناصر نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا،

"لیکن بیچاری کا دل ٹوٹ جائے گا، ذرا سوچو تو سہی، کس دا عبیہ سے کہہ رہی تھی، جلیئے صفدر کو بھی لے آیئے، محمود نے کہا وہ نہیں آئینگے وہ بولی، نہ آئیں تو زبردستی لے آیئے! آپ تو بڑے بے تکلف دوست ہیں ان کے میں نے پوچھا! اور اگر پھر بھی وہ نہ آئے تو؟ کہنے لگیں جناب صبیحہ بیگم صاحبہ تو پھر میں بیت بازی میں حصّہ نہیں لوں گی تو سب لڑکیاں بیک آواز بول اٹھیں، پھر ہم بھی حصّہ نہیں لیں گے تو جناب اپنی ضد پر ایک نہایت دلچسپ پروگرام غارت نہ کیجئے، تشریف لے چلیئے، ورنہ جب بدمزہ ہونا ٹھہرا تو پھر تمہاری مسرت ہی کیوں نہ کر دی جائے،

صفدر نے یہ باتیں سنکر کہا،

"اب تو کچھ کچھ اس پروگرام سے مجھے بھی دلچسپی ہو چلی ہے!"

محمود خوش ہو گیا،

"تو آؤ ——— قسم خدا کی وہ مزار ہے گا کہ یاد کرو گے عمر بھر ——— یہ لڑکیاں صرف ناول اور افسانے، پڑھنا جانتی ہیں، شاید ہی کسی کو دس پانچ شعر یاد ہوں وہ بھی زیادہ تر

مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے بیت بازی سے!"
ناصر نے گرفت اور مضبوط کر لی،
"خدا کے بندے سنو تو سہی!" ——— لڑکیوں اور لڑکوں میں بیت بازی ہے ایک طرف لڑکیاں، دوسری طرف لڑکے!"
صفدر نے بے پروائی سے کہا،
"تو میں کیا کروں؟"
ناصر نے حکم دیا،
"چلو ہمارے ساتھ!"
محمود نے کہا،
"ورنہ ہم زبردستی لے چلیں گے، ہم جیسے دو شہ زور آدمیوں کا مقابلہ تم جیسا دھان پان آدمی نہیں کر سکتا، بے آبروئی نہیں چاہتے تو چپ چاپ چلے چلو، ورنہ پا بدستے دگرے ۔ دست بدستے دگرے چلنا پڑے گا!"
ناصر توجہ سے محمود کی باتیں سننے میں منہمک تھا، صفدر نے ایک جھٹکے میں وہ ہاتھ بھی چھڑا دیا جو اس کی گرفت میں تھا، پھر اکڑتے ہوئے کہا دیکھ لیا تم شہ زوروں نے مجھ مرد ناتواں کا عالم، اب خیریت چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ، ورنہ پھر میں سختی سے پیش آؤں گا!"
ناصر نے اسے سمجھاتے اور مناتے ہوئے کہا،
"بھائی ہم خود نہیں آئے ہیں!"
محمود نے تائید کی،

"بھائی ان سب لڑکیوں کو مشکل سے چالیس پچاس اشعار یاد ہو نگے وہ بھی زیادہ تر ناموزوں اور یہاں یہ حال ہے کہ دیوان کے دیوان یاد ہیں وہ بھی ردیف وار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بندہ خود بھی شاعر ہے اگر کوئی موقع کا شعر نہ یاد آیا تو نیا شعر موزوں کرتے کتنی دیر لگتی ہے؟"

یہ تجویز سنکر ناصر پھڑک گیا،

"واقعی مزا آجائے گا، چلو صفدر!"

صفدر نے کہا،

"لیکن ایک شرط ہے؛"

محمود نے ذرا غصہ میں کہا،

"وہ بھی کہہ چکو کسی طرح —— تم تو نکاح کی طرح شرطیں پیش کر رہے ہو!"

صفدر نے کہا،

"شرط یہ ہے کہ بے ایمانی نہیں ہونے پائے گی!"

محمود نے ایک قہقہہ لگایا،

"کمال کر دیا بھئی، ہمیں بے ایمانی کرنے کی کیا ضرورت ہے بے ایمانی تو دیکھ لینا لڑکیاں کریں گی، ان کا پلّہ کمزور ہے ہمارا مضبوط!"

ناموزوں، یہاں میں اکیلا ان سب پر حاوی ہوں!"

صفدر نے پوچھا،

"اس غلط فہمی اور غلط بیانی کا سبب!"

ناصر ہنسنے لگا،

"یار بڑے پتہ کی بات کہہ گئے"، واقعی یہ شخص ہمیشہ غلط فہمی سے زیادہ خود پسندی میں مبتلا رہتا ہے، اور غلط بیانی تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے ——— لیکن ذرا پوچھو تو سہی اس کا مقصد کیا ہے!

محمود بیچ میں خود ہی بول پڑا!

"نہیں صفدر صاحب آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں، میں خود ہی بتائے دیتا ہوں ——— میں کہہ یہ رہا تھا کہ بیت بازی میں ان لڑکیوں کو شکست فاش دینا بڑا آسان کام ہے، اور آپ حضرات صرف چل کر بیٹھ جائیے، تماشہ دیکھئے، میں اکیلا اگر سب کا ناطقہ نہ بند کر دوں تب کی بات!"

صفدر نے چھیڑا،

"یہ تو وہی بات دوسرے الفاظ میں تم نے دہرا دی ——— ———!"

ناصر نے سوال کیا

"یہ بتاؤ کس طرح تم اکیلے غالب آجاؤ گے سب پر ———!"

محمود نے جواب دیا۔

(۶)

یکایک بارہ دری کا وہ مقام، جہاں صفدر، محمود اور ناصر کھڑے تھے، مقام رنگ و بو بن گیا، صبیحہ کی سرکردگی میں تمام لڑکیاں آگئیں، اور انہوں نے ان تینوں کو گھیر لیا، صبیحہ نے ایک نگاہِ غلط انداز صفدر پر ڈالی، پھر محمود سے کہا،

"جناب پہلی مات آپ پر ہوئی ——— !

پھر صفدر سے کہا

"آپ گواہ رہیے گا!"

ناصر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا،

"گواہ تو میں بھی ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ بیت بازی شروع بھی نہیں ہوئی اور مات کا فیصلہ آپ نے کر دیا، یہ کیا بات ہوئی؟"

صبیحہ نے بل کھاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے کہا،

جو لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں، ان پر خود بخود مات ہو جاتی ہے!"

محمود نے کہا،

"لیکن بھاگا کون تھا، میں تو آپ کا بھیجا ہوا یہاں آیا تھا!" (صفدر کی طرف اشارہ کر کے) اس مجرم کو پکڑتے!"

صبیحہ نے جواب دیا،

جی، اس کی کوئی سند نہیں، اگر صفدر صاحب نہیں آ رہے تھے آپ کو واپس چلا آنا چاہیے تھا، اتنی دیر لگا دینے کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے محسوس کر لیا کہ جیت نہیں سکتے، لہٰذا باعزت طریقہ یہ ہے کہ مات مان لیجئے ورنہ پھر ہم خود ہی باقاعدہ آپ کی شکست کا اعلان کر دیں گے، اور اب جو بیت بازی شروع ہو گی، وہ دوسری ہو گی، پہلی تو گویا ہو گئی اور آپ ہار گئے ——— کیوں صفدر صاحب؟"

صفدر نے بڑی مستعدی سے کہا،

"اور کیا ——— دیکھ لیجئے گا دوسرے کا انجام بھی یہی ہو گا!"

محمود بگڑ گیا،

"کم بخت تو پورس کا ہاتھی ہے، اپنے ہی آدمیوں کو روندے ڈال رہا ہے ——— جا ہم نے تجھے خارج کیا اپنی جماعت سے!"

"ہمیں بھی!"

صبیحہ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا،

"آپ کا اعتراض قابلِ غور نہیں، آپ کو یہ حق تو ہے کہ کسی کو اپنی ٹولی میں شامل نہ کریں، لیکن یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ کسی کو تماشائی کی حیثیت سے بھی نہ بیٹھنے دیں ——— آیئے صفدر صاحب!"

محمود نے کہا،

"لیکن میرا احتجاج نوٹ کر لیجیے۔"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"کر لیا نوٹ ——— اب زیادہ باتیں نہ کیجئے، ورنہ دوسری مرتبہ بھی آپ کے مات کھا جانے کا اعلان کر دیا جائے گا، اور اب جو بیٹ بازی شروع ہوتی وہ تیسری ہو گی!"

محمود نے بے بسی کے ساتھ کہا،

"اچھی زبردستی ہے!"

پھر گردن جھکا کر ساتھ ہو لیا!

پھر وہ صبیحہ سے مخاطب ہوا۔

"بہت اچھا جناب، میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں، میں نے مات مان لی، آئیے دوسری بیت بازی یہیں شروع ہو جائے" اور میں چیلنج کرتا ہوں کہ کم از کم دس تابڑ توڑ مات دوں گا آپ کو،

صبیحہ نے اپنی سہیلیوں کی طرف سے کہا۔

مجھے یہ چیلنج منظور ہے ———

پھر وہ صفدر سے مخاطب ہوئی،

"آئیے!"

محمود اکڑ گیا،

ہرگز نہیں،

ناصر نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہا،

"یہ اس قابل نہیں ہے کہ ہمارا ساتھی بنے،

صفدر نے بے پروائی سے کہا،

"میں خود بھی تم جیسے نالائقوں کے ساتھ مل کر کھیلنا اپنی توہین سمجھتا ہوں، ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے تو میری شرکت پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہیئے!"

محمود نے چیخ کر کہا،

"ہمیں ہے"

ناصر نے بھی سر میں سر ملایا،

"یہ کیا مذاق ہے؟"

صفدر بول پڑا،

"مذاق! اجی حضرت یہ درسِ عبرت ہے، ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ بڑا دعویٰ تھا آپ کو اپنی سخن طرازی کا، شعرا کے دیوان آپ کو ازبر تھے اور وہ بھی ردیف وار، خود بھی خیر سے شاعر ہونے کے مدعی ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ پہلے منہ بسور رہے تھے، اب رو رہے ہیں ——————————
لاحول ولا قوۃ، میں ہوتا تو ڈوب مرا ہوتا،!"

محمود کافی زچ ہو چکا تھا، ان تلخ باتوں کا جواب اس نے بڑے شیریں الفاظ میں دیا،

لیکن میرے بھائی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آخر ہر شعر میم ہی پر کیوں ٹوٹتا ہے؟

صبیحہ بولی،

"ٹوٹتا ہے اور ٹوٹے گا، آپ کو بھی اختیار ہے کہ جس لفظ پر چاہیں اپنا شعر ختم کریں، اگر جواب میں ذرا بھی سستی میری طرف سے ظاہر ہو تو فوراً مات قبول کروں گی!!"

محمود نے صبیحہ کو باتوں میں الجھاتے ہوئے نیم کا شعر سوچنے کا سلسلہ برابر دل ہی دل میں جاری رکھتے ہوئے کہا،

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اسے معقولیت تو نہیں کہتے،!"

صبیحہ بولی،

(۷)

آم کے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے دونوں پارٹیاں آمنے سامنے بیٹھ گئیں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے بیت بازی کا آغاز ہوا محمود صاحب نے "میم" کے شعر کا مطالبہ کیا، صبیحہ نے فوراً وہ شعر سنا دیا جو میم سے شروع ہوتا تھا اور میم پر ختم ہوتا تھا محمود نے فوراً میم کا شعر سنا دیا، جس کا آخری حرف الف تھا، صبیحہ نے الف کا شعر سنایا، جو میم پر ختم ہوتا تھا،

اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ سب لوگ بیٹھے منہ تک رہے ہیں، اور بیت بازی صرف صبیحہ اور محمود کے درمیان جاری ہے، محمود کا سنایا ہوا شعر کسی لفظ پر بھی ختم ہو، صبیحہ اس کے جواب میں جو شعر پیش کرتی تھی، وہ بہرحال میم پر ختم ہوتا تھا۔۔ ۲۰ - ۲۵ شعر تک تو محمود نے بڑی برجستگی سے تابڑ توڑ جوابی شعر سنائے، لیکن جب صبیحہ کا پیش کیا ہوا ہر شعر میم ہی پر ختم ہونے لگا تو محمود صاحب جھکراتے، کہنے لگے۔

صفدر جھپ بول پڑا،

"واقعی ترس ہے ——— مس صبیحہ میں سفارش کرتا ہوں اب معاف کر دیجیے، غریب کو ڈر ہے کہیں اس کی حرکت قلب نہ بند ہو جائے چہرہ تو دیکھیے، سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔"

سب لوگ ہنسنے لگے، محمود بہت خفیف ہوا، صبیحہ نے پوچھا،

"کیوں محمود صاحب کیا رائے ہے، واقعی معاف کر دوں؟"

محمود اُٹھ کھڑا ہوا،

"بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے معافی مانگ کر شکست کی بدنامی سے اپنے آپ کو بچا لیا!"

لوگ پکارتے ہی رہ گئے۔ لیکن وہ میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا ———!

~ مرجائیں گے پر ہار نہ مانیں گے کبھی بھی
ہم وہ ہیں کہ مرنے پہ بھی ہارا نہیں کرتے

صفدر ہنستے ہنستے لوٹ گیا اس شعر پر،
"اب ایسے شعر موزوں کرنے پر اُتر آتے ہو بھائی؟"
محمود نے صفدر کو جواب نہیں دیا۔ صبیحہ سے کہا،
"لایئے! "ی" کا شعر،!"
صبیحہ کے پاس شعر موجود تھا،
"لیجیے"، ———

~ یہ ترا در ہے کہ آ بیٹھے ہیں ناہم
اپنے جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھے ہیں ہم

محمود کا چہرہ سُرخ ہو گیا،
"پھر ہم"
صبیحہ مسکراتی ہوئی بولی،
"جی ——— اور اس کے بعد بھی!!"
محمود نے کچھ کہنا چاہا۔
"لیکن ———"
"باتیں بعد میں، پہلے شعر ——— ارشاد!!
خوش قسمتی سے کسی اُستاد کا شعر محمود کو یاد آگیا،

~ میرے رونے کی، تجھے یار خبر ہے کہ نہیں؛
دیکھ لے اشک سے دامن مرا تر ہے کہ نہیں؛

میں لگاتے ہوئے کہا،

"لیکن محمود صاحب بھاگے خوب ______ ! بہت بنتے تھے!"

"آج تو اس نے ایسی منہ کی کھائی ہے، کہ اب کئی دن تک یاروں کو منہ نہیں دکھا سکے گا!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"ان بیچارے کے بارے میں اتنے زیادہ حسن ظن سے کبھی کام نہ لیجیے!"

صفدر کو بے تحاشا ہنسی آگئی، وہ گویا ہوا،

"بڑے مزے کی بات کی ہے آپ نے ______ ضرور سناؤں گا اسے! !"

صبیحہ نے کوئی جواب نہیں دیا، گلاب کا ایک دوسرا پھول توڑا، اور اسے گھما گھما کر سونگھنے لگی، صفدر نے کہا۔

"آج ہماری گفتگو جو ہوئی تھی، وہ ذہنی تو نہیں تھی؟"

صبیحہ نے پھول کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا،

"آپ کا خیال ہے؟"

وہ بولا،

"جو آپ کہہ دیں!" ______ لیکن ذرا سوچ سمجھ کر!"

صبیحہ نے ایک جاں نواز تبسم کے ساتھ صفدر کی طرف دیکھا، اور

(۸)

محمود کو بھاگتا دیکھ کر صبیحہ ہنسنے لگی، کئی لوگ پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے دوڑے، لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا،

بیت بازی ختم ہونے کے بعد لوگ پھر مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگے،

صبیحہ اور صفدر بھی آہستہ آہستہ، خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے سرو کے ایک درخت کے پاس آکر رُک گئے،

صفدر نے کہا،

"آج تو کمال کر دیا آپ نے ۔——— آپ کو اتنے شعر یاد ہیں اور وہ بھی اتنے قابو کے ساتھ کہ جو شعر جس لفظ پر چاہا ختم کر دیا یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا!"

صبیحہ نے پاس کے ایک درخت سے گلاب کا پھول توڑ کر، اپنے سر

صفدر شاید صاف الفاظ میں اس سے اعتراف کرانا چاہتا تھا، اس نے کہا،

"یہ تو آپ نے ایک اصولی بات بیان کی ہے، خود اپنا حال بتلایئے"،

صبیحہ نے ایک انداز خاص کے ساتھ اسے گھورا پھر گویا ہوئی،

"کیا مجھے بے اصول آدمی سمجھتے ہیں؟"

پھر اپنے ہاتھ کا پھول زمین پر پھینک کر وہ ایک اور پھول توڑنے کے لئے درخت پر جھکی اور آہستہ سے بولی،

"ناصر صاحب آرہے ہیں! ان کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں!"

صفدر خاموش ہو گیا، جیسے ہی پھول توڑ کر اس نے سر اٹھایا، ناصر بالکل قریب آگیا، اُس نے کہا،

"مس صبیحہ اب وقت ہو گیا، چلنا چاہیئے!"

وہ پھول ہاتھ میں لے کر کہنے لگی،

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی، آیئے چلئے، واقعی بڑی دیر ہو گئی ہے!"

کہنے لگی،

"یہ شرط بھی ہے؟"

"اگر آپ مان لیں!" ————————— "میں صرف ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں!"

صبیحہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، اس نے کہا۔

"میں آپ کو چاہتا ہوں، میں آپ سے محبت کرتا ہوں، میرے دل کی آرزو اور آنکھوں کی تمنّا صرف آپ ہیں، یہ معلوم کر کے میرا دل خوشی کا جھولا جھولنے لگا کہ آپ مجھے ٹھکراتی نہیں، ہیں، اب اتنا اور بتا دیجئے، کیا آپ کے دل میں بھی میرا کچھ خیال ہے؟ ————————— اگر آپ کے دل میں میرا تھوڑا سا خیال ہو تو یہ میری سب سے قیمتی پونجی ہو گی، اتنی ہمت تو مجھ میں نہیں ہے کہ اپنی محبت کے جواب میں آپ سے بھی محبت کا مطالبہ کر سکوں؟"

صبیحہ غور سے اس کی باتیں سنتی رہی پھر بولی،

"اگر آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں تو پھر اس سوال کا جواب خود آپ کے پاس ہے، مجھ سے کچھ نہ پوچھئے!"

صفدر نگاہِ محبت سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ ایک جملہ ختم کر کے ذرا ذرا خاموش ہوئی، پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔

"محبت کبھی بھی بے اثر، اور بے نتیجہ نہیں رہتی، اس میں اتنی کشش اتنی قوت ہوتی ہے کہ اگر چاہے تو چاند اور سورج کو کھینچ لے"

(۹)

صبیحہ اور ناصر واپس جانے کے لئے مڑے، لیکن صفدر وہیں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔!

ناصر نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا،

"کیا آج یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"

صفدر چونک پڑا،

"نہیں بھئی یہاں رہ کر کیا کروں گا، چلو!"

ناصر نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور گویا ہوا،

"میں نے سوچا شاید!"

صفدر نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"آپ تو احمق ہیں اچھے خاصے، چلیئے تشریف لے چلیئے!"

صبیحہ آگے نکل گئی تھی، دوسرے ساتھی بھی آگے آگے چل رہے تھے، صفدر

اور ناصر سب سے پیچھے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے صدر دروازہ کی طرف بڑھ رہے تھے، ناصر نے کہا،

"کہو وطن کب جا رہے ہو ——— کرسمس کا سارا زمانہ ختم ہو گیا اور تم یہیں ڈٹے ہو!"

صفدر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"میں نے ارادہ ملتوی کر دیا"!

ناصر نے مصنوعی پریشانی کے ساتھ پوچھا،

"اتنا مستحکم ارادہ یوں پانی کی طرح بہہ گیا؛ ——— ضرور کوئی خاص بات ہے ہمیں نہ بتاؤ گے!"

صفدر نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا،

"اتنے زیادہ بھولے نہ بنو! ——— جیسے انہیں کچھ معلوم ہی نہیں!" ———

ناصر نے ذرا بے اعتمادی کے لہجہ میں کہا،

"میں سمجھتا تھا، تم مجھے اپنا رازدار سمجھتے ہو، اب معلوم ہوا، میرا خیال غلط تھا!" ———

"پھر صحیح خیال کیا ہے؟"

"یہ کہ تم دغاباز ہو!"

"یہ کیوں؟"

"اس لئے کہ راز کی بات نہیں بتاتے!"

یہ انقلابِ عظیم کیسے رونما ہوا ؟"

"خدا کی دین سمجھ لو، جس نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا تھا، وہی میری زندگی بن گئی، جس نے میرے دل پر زخم لگایا تھا، اسی نے اپنے دستِ نازک سے پھاہا رکھ دیا اس پر، جس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا، اسی نے مجھے باریاب کر لیا، نہیں ناصر، اس نے مجھے کبھی نہیں ٹھکرایا تھا، یہ میری غلط فہمی تھی، وہ تو ہمیشہ سے مائل بہ کرم تھی"

"اماں کیا کہہ رہے ہو ؟"

"ناصر تم اندازہ نہیں کر سکتے، میری مسرت کا کیا عالم ہے ؟ میں خوش ہوں، مسرور ہوں، میری خوشی حدِ بیان سے باہر ہے، میری مسرت ناقابلِ تصور ہے، اب میں ہوں، اور زندگی، زندگی کی کامیاب حسرتیں اور تمنائیں، ناصر تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں خوش ہوتے ؟ کیوں نہیں ہنستے ؟ کیوں نہیں قہقہے لگاتے ؟ کیوں نہیں گاتے ؟ کیوں نہیں ناچتے ؟ ——————"

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جنون کی اس منزل تک یہ خاکسار نہ پہنچا ہے، نہ پہنچنے کا ارادہ ہے،!"

"ناصر تم مجھے مجنون سمجھتے ہو ؟ دیوانہ خیال کرتے ہو ؟"

"جی دیوانہ بھی اور مجنوں بھی۔ جب راہ چلتے لڑکے تم پر سنگ باری کریں گے، تو تمہاری لیلےٰ منہ سے کچھ کہے یا نہ کہے، میں ضرور نعرہ لگاؤں گا —————— کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو !"

"پھر مجھے چھوڑ کر تمہاری خبر لینے لگیں گے !"

"لیکن خدا کے بندے اس میں راز کی بات کیا ہے، پہلے ارادہ تھا کالج چھوڑ دوں گا، وطن چلا جاؤں گا، پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا ——

"مگر اب کیا ارادہ ہے؟"

"یہ کہ کالج نہیں چھوڑوں گا، وطن نہیں جاؤں گا، لہٰذا دوبارہ واپس آنے یا نہ آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا!"

"یہ تو معلوم ہے، مگر سوال یہ ہے کہ دلِ بیتاب اس درجہ سکون کی طرف کیوں مائل ہے؟ وہ وحشت کیا ہوئی؟ وہ سرگشتگی کہاں گئی؟ وہ جوشِ جنوں کہاں روپوش ہے؟ وہ زندگی سے بیزار، وہ دوستوں سے ترکِ تعلق، وہ آہِ سرد، وہ چشمِ اشک بار، وہ غمزدہ چہرہ، وہ افسردہ کیفیت، یک بیک یہ سب چیزیں کہاں غائب ہو گئیں؟"

(مسکراتے ہوئے) اب مجھے ان کی ضرورت نہیں، میں ان سے بیزار ہوں، متنفر ہوں!"

"یہ بات ہے؟"

"ہاں ———— اب مجھ میں زندہ رہنے کی امنگ ہے زندگی سے لطف لینے کا ولولہ ہے، زندگی کی بہار اندر بہار رعنائیوں سے کیف اٹھانے کی تمنّا ہے، مایوسی میرے خانۂ دل میں قدم نہیں رکھ سکتی نامرادی سے میرا بیر ہے، اب میں ہوں اور مچلتی ہوئی آرزوئیں——

"مبارک، مبارک، سلامت سلامت ———— لیکن دفعتہً

(۱۰)

واقعی اب صفدر کی سرخوشی اور نشاط کا عالم ہی کچھ اور تھا، !
شاید ہی کوئی دن ناغہ جاتا ہے، جب وہ صبیحہ سے نہ ملتا ہو، دونوں ملتے، اور باتوں میں محو ہو جاتے، دنیا و مافیہا سے بے خبر، دنیا والوں سے بے پرواہ، اپنی دھن میں مست، اپنے حال میں مدہوش،
گھنٹوں اور پہروں، دونوں میں باتیں ہوا کرتیں،
ایک روز صبیحہ اور صفدر بیٹھے ہوئے اسی طرح باتیں کر رہے تھے صفدر نے کہا۔
"اب امتحان میں چند روز باقی رہ گئے ہیں، تم بھی بی، اے کر لو گی، میں بھی ایم اے ہو جاؤں گا —————"
وہ تذبذب عالم میں بولی
"آپ تو ضرور ایم اے کر لیں گے، لیکن میں بی اے کر لوں گی، یہ مشتبہ

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یکا یک کسی نے پیچھے سے آکر دونوں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا،

ناصر نے کہا،

"محمود تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے!"

محمود نے ہاتھ ہٹا لیا اور کہنے لگا

"تم دونوں کی ساری باتیں میں نے سن لی ہیں!"

پھر ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا ——————!

صبیحہ کچھ دیر چپ رہی پھر اس نے کہا،

"اتنی جلدی کیوں ہے، آپ کو؟"

وہ بولا،

کاش ذرا دیر کے لئے ہم تم اپنے دل کا تبادلہ کر سکتے!"

صبیحہ نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا، اور بولی،

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

صفدر نے جواب دیا۔

"تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ مجھے اتنی جلدی کیوں ہے؛ تم مجھ سے زیادہ بیتاب بیقرار ہوتیں، مجھ سے زیادہ تمہیں جلدی ہوتی، اگر میرا دل صرف چند لمحوں کے لئے تمہارے سینہ میں پہنچ جاتا"

صفدر کی ان باتوں سے صبیحہ بہت متاثر نظر آ رہی تھی، کچھ دیر وہ خاموش رہی، پھر آنکھیں نیچی کئے کئے اس نے کہا،

میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھی اب تک ——— میرا خیال تھا، ہم دونوں کے دل ایک ہو چکے ہیں!!"

ان الفاظ نے بجلی کا سا اثر کیا، صفدر کے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، اس نے بڑے جذبات انگیز انداز میں کہا،

"صبیحہ ———"

اور پھر کچھ نہ کہہ سکا، اس کا گلا رندھ گیا!

صبیحہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اس کے نازک ہونٹوں نے کچھ

سی بات ہے۔!"

"واہ یہ کیوں؟"

"اپنی کمزوریوں سے میں واقف ہوں!"

"لیکن تمہاری ذہانت، قابلیت اور اہلیت سے ہر استاد، ہر ممتحن اور ہر ساتھی واقف ہے، میں پیش گوئی کرتا ہوں، تم کامیاب ہوگی، بلکہ اوّل آؤ گی"

صبیحہ ہنسنے لگی

"اگر آپ ممتحن ہوتے تو واقعی آپ کی پیش گوئی پوری ہو کر رہتی، لیکن سُنا ہے ہمارے پرچے ڈاکٹر شیخ دیکھیں گے، اور وہ سختی سے نمبر دینے میں بدنام ہیں!"

صفدر نے بے پروائی سے کہا،

"وہ ڈاکٹر شیخ ہوں یا ڈاکٹر مرزا، اگر ان میں دیانت کا ذرا بھی شائبہ ہے تو وہی ہوگا جو میں نے کہا"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"آپ کے منہ میں گھی شکر! ——— لیکن خیر امتحان میں تو ابھی کئی مہینے ہیں، آپ کہہ کیا رہے تھے؟"

صفدر نے، کچھ رکتے رکتے کہا،

"میں چاہتا ہوں امتحان کے بعد ہم باقاعدہ طور پر ایک دوسرے کے شریکِ زندگی بن جائیں۔!"

"آپ صرف جوش ہیں، اور میرے پاس جوش کے ساتھ ہوش بھی ہے، آپ کی نظر میں ہر رکاوٹ اس لئے ہے کہ ٹھکرا دی جائے، میں کوشش کرتی ہوں کہ اس سے کترا کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکوں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بے شک آپ سے زیادہ سختی کے ساتھ میں اسے ٹھکرا سکتی ہوں!"

صبیحہ کے یہ الفاظ سُنکر صفدر کا چہرہ زرد پڑ گیا، اُس نے ڈرتے کہا۔

کیا ہمارے راستہ میں کوئی رکاوٹ بھی ہے؟"

صبیحہ نے بے تکلف جواب دیا،

"کیوں نہیں ہے، میرا خاندان آپ کا کنبہ —— کیا یہ دو بڑی اور مستقل رکاوٹیں نہیں ہیں؟"

"ہیں —— لیکن میں انہیں خاطر میں نہیں لاتا، میں اپنی زندگی کا مختار ہوں، مجھے حق ہے کہ اپنا مستقبل خود بناؤں، ماں باپ اور دوسرے بزرگ خاندان میرے راستہ کا پتھر بننے کا کوئی حق نہیں رکھتے، انہیں میری مدد کرنی چاہیئے میرا ساتھ دینا چاہیئے، میری حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے، تو ——"

"تو آپ کیا کریں گے؟"

"وہی کروں گا، جو مجھے کرنا چاہیئے!"

"یعنی —— ؟ —— ذرا تفصیل سے کہیئے!

جنبش سی کی، لیکن کوئی لفظ منہ سے نہ نکلا،

صفدر بھی ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہا تھا، ذرا دیر بعد اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"عجیب چیز ہو تم بھی"!،

وہ ایک ادا سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی،

"اس انکشاف کا مطلب؟"

وہ کہنے لگا،

"مارتی بھی ہو اور سہلاتی بھی ہو، تسلی بھی کرتی ہو، جلاتی بھی ہو، ٹھکراتی بھی ہو، اور باریاب بھی کرتی ہو، غم و آلام بھی دیتی ہو اور نشاط و طرب کی نعمت بھی عطا کرتی ہو ———— آخر میں تمہیں کیا سمجھوں؛ تم کیا ہو؟"

وہ زیرِ لب تبسم کے ساتھ گویا ہوئی،

"چڑیل"!

صفدر ہنسنے لگا،

"لاحول ولا قوۃ ———— بہرحال یہ بتاؤ میری جلدی پر تمہیں اعتراض کیا ہے؛ کیا تم میری بیتابی اور بے قراری نہیں دیکھتیں؟"

وہ بولی،

"دیکھتی ہوں اس سے متاثر بھی ہوتی ہوں"

"پھر بھی یہ سرد مہری؟"

"لیکن اس میں مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے ؟"

صفدر نے بے چارگی کے عالم میں پوچھا ،

"کیا اب بھی مجھے پُر امید رہنا چاہیئے ؟"

صبیحہ نے بڑے اطمینان سے کہا ،

"یقیناً ! ——————— میں تو ذرا بھی مایوس نہیں ہوں ، ! ————"

صفدر خاموش ہو گیا ، وہ سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا ، صبیحہ نے اس کی یہ کیفیت نہ دیکھی گئی ، شاید وہ اُسے مغموم اور افسردہ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی ، اس نے کہا ،

"بیٹھئے یہاں ہیں سیر کہیں کی کر رہے ہیں ——————— میں جاتی ہوں ۔"

صفدر چونک پڑا ، اور غمگین نظروں سے اُسے دیکھنے لگا صبیحہ نے دل کو موہ لینے والے انداز سے دیکھا اور کہا ،

"آپ میرا کہنا نہیں مانیں گے ؟"

صفدر نے پریشان ہو کر کہا ،

"لیکن میں نے تو کچھ نہیں سُنا ، اگر سُنا ہوتا تو کیونکر ممکن تھا کہ نہ مانتا !"

صبیحہ نے ایسے انداز میں کہ تحکم بھی شامل تھا کہا ،

"آخر آپ مسکراتے کیوں نہیں ؟"

اس عجیب سے مطالبہ پر بے ساختہ صفدر کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا ،

"یعنی یہ کہ میں ان کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا؟"

"بے شک آپ یہ کر سکتے ہیں، لیکن کیا آپ کا خیال ہے، عورت بھی اتنا بیباکانہ قدم اُٹھا سکتی ہے؟ کیا آپ کے نزدیک ایک مظلوم، مجبور اور پسماندہ مسلمان عورت اتنی ہمت رکھتی ہے؟

صفدر نے ہمت ہار دی،

"صبیحہ ان باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"آپ تو انگریزی بھی بہت اچھی جانتے ہیں، لیکن ہماری یہ گفتگو اردو میں ہو رہی ہے، جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہماری مادری زبان ہے"

صفدر نے ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح کہا۔

"اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی رکاوٹ واقعی تمہارے راستہ میں موجود ہے"

صبیحہ نے جواب دیا،

"ہاں ہے!"

"کیا اس کی تفصیل بتا سکو گی؟"

"آپ سے کوئی بات چھپانا خیانت سمجھتی ہوں، والدہ اپنے بھائی کے لڑکے سے میری نسبت کر چکی ہیں!"

صفدر بالکل مایوس ہو گیا،

"بس تو پھر، وہی ہو گا جو وہ چاہیں گی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے اُمید کا دامن چھوڑ دینا چاہیئے!"

یہ بات صفدر نے کچھ ایسے جگر دوز لہجہ میں کی کہ صبیحہ بیتاب ہو گئی

مایوسی

اور محزوں بھی ہم سنے تھے دلے
میرؔ سا ہو سکے ہے کم کوئی!

●

صبیحہ خوش ہو گئی،

"ہاں ——— یہی تو میرا کہنا ہے، مسکرائیے، ہنسیے، خوش رہیے، فکر و اندیشہ کو پاس نہ آنے دیجئے ——— پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے؛

وہ بھی مسکرانے لگی، اور اس کے ساتھ صفدر بھی!

---

(۱)

صبیحہ کے ان الفاظ نے بھی کہ

"میں تو ذرا بھی مایوس نہیں ہوں!"

صفدر کی مایوسی اور ناامیدی میں کوئی کمی نہیں کی، وہ خاموش ہو گیا، اور گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا، صبیحہ آج اس کے حال سے بہت متاثر تھی، اس نے کہا،

"کیا سوچنے لگے آپ؛"

وہ اسی طرح گردن جھکائے جھکائے بولا،

"سوچ رہا ہوں، جب وہ وقت آیا کہ میری آرزو اور تمنا پوری ہو مشیت کے بے رحم ہاتھوں نے ایک مرتبہ پھر، مجھے بے بس کر دیا!"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں،

صبیحہ نے کہا،

ہاں اگر تم اجازت دو!"

وہ کہنے لگی،

"میری طرف سے تو اجازت ہے ———— لیکن آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ بھی تو معلوم ہو؟"

صفدر نے فیصلہ کن انداز میں کہا،

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارے والد صاحب سے ملوں، وہ مجھے جانتے ہیں میرے والد اور وہ کالج کے ساتھی ہیں، آج تک میں ان سے نہیں ملا ہوں اب ملوں گا، اور مجھے یقین ہے وہ ضرور ہمدردی کے ساتھ میرے کیس پر غور کریں گے!"

صبیحہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا،

"نہیں یہ مناسب نہیں ہے!"

"کیوں، کس لئے مناسب نہیں ہے؟"

"اس طرح بات بڑھ جائے گی ———— میں بطور خود آپ سے بہتر طور پر یہ گتھی حل کروں گی، مجھ پر اعتبار کیجئے،!"

صفدر نے ملول و غمگین لہجہ میں کہا،

"تم پر تو دل و جان سے اعتبار کرتا ہوں، لیکن ———— اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا!"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"یہ آپ کا دل بڑا نالائق ہے، سچوں کو جھوٹا سمجھتا ہے، اس کی

"خدا کے لئے حوصلہ نہ ہاریئے آپ تو مجھے بھی مایوس اور دل شکستہ کئے دے رہے ہیں، میری ہمت بندھایئے، میرا حوصلہ قائم رکھیئے، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، آپ کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا!"

صفدر نے آنکھیں اُٹھا کر اسے دیکھا، اور مایوسی کے عالم میں کہا،

"تمہارے ان الفاظ میں ہمدردی ہے، جوش ہے، خلوص ہے، لیکن خود ہی ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہہ چکی ہو، عورت مظلوم ہے، مجبور ہے، پس ماندہ ہے، ہمت سے محروم، عزم سے تہی دامن، آخر تم اپنی والدہ کا اور خاندان کا کس طرح مقابلہ کر سکو گی؟"

وہ خود اعتمادی کے لہجہ میں بولی،

"اسے مجھ پر چھوڑ دیجئے!"

صفدر نے کہا،

"اسے اگر تم پر چھوڑ دوں تو پھر تمہی کو چھوڑنا پڑے گا!"

وہ ہنسنے لگی،

"اے واہ، یہ کیوں؟"

صفدر نے نہایت یقین کے ساتھ کہا،

"تم کچھ نہیں کر سکتیں"

اس نے پوچھا،

"اور آپ کر سکتے ہیں؟"

وہ بولا،

"یہ لیجئے، یک نہ شد دو شد، اب کالج آنا بھی گیا!"

صبیحہ کو ہنسی آ گئی،

"آپ تو ہر بات میں مایوسی کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں، میرا یہ مطلب تھوڑے ہے کہ اب کبھی کالج نہیں آؤں گی، دو چار دن میں انشاء اللہ ان معاملات کا فیصلہ ہو جائے گا، پھر دوڑی دوڑی آؤں گی۔ آپ کے پاس خوش خبری لے کر، !"

صفدر نے بے اعتباری کی نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا،

"سچ کہتی ہو؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"جھوٹ ———— "

اور چلی گئی، !

بات نہ سنیئے اسے سزا دیجئے!"

صفدر پھر خاموش ہو گیا۔ صبیحہ نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا،

"پھر چپ ہو گئے آپ!"

صفدر نے ایک ٹھنڈی سانس لی،

"ہاں صبیحہ، چپ ہونا ہی پڑتا ہے —— ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں؛"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں، اماں جان بے شک اپنے بھائی کے صاحبزادے پر ریجھی ہوئی ہیں، ان کا فیصلہ یہی ہے کہ انہیں میرا رفیق زندگی بنا دیں۔ اور ایمان کی پوچھئے تو وہ ہیں بھی شریف اور معقول آدمی، لیکن میرا جہاں تک تعلق ہے، کسی قیمت پر بھی میں انہیں اپنا شریک حیات نہیں بنا سکتی، میں نے سوچا ہے کہ ابا جان کو سارا حال ایک چٹھی لکھ کر بتا دوں گی، وہ مجھے بہت زیادہ چاہتے ہیں، اماں جی لاکھ سر پٹکیں مگر ابا وہی کریں گے جو میں چاہوں گی!!"

پھر کلائی پر لگی ہوئی ننھی سی گھڑی پر اس نے ایک نظر ڈالی،

"بہت دیر ہو گئی، اب اجازت دیجئے، میرا یہ عہد ہے کہ اب کالج میں اس وقت تک قدم نہیں رکھوں گی جب تک اماں اور ابا سے حسب مرضی فیصلہ نہیں کرا لوں گی ——"

صفدر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا،

ہاں جاکر حالات کا اندازہ کرنا ہے، وہ سوٹ بدل رہا تھا کہ محمود نے اُسے کہیں باہر جانے کی تیاری کرتے دیکھ لیا، اُس نے فوراً سوال کیا،

"کدھر کا ارادہ ہے حضور؟"

بات ٹالنے کے لئے، صفدر نے جواب دیا،

"ذرا شہر تک —— کچھ شاپنگ کا ارادہ ہے!"

محمود خوش ہو گیا،

"جزاک اللہ، —— تری آواز مکّہ اور مدینے، طبیعت خوش کر دی بھئی، ہم بھی کئی دن سے یہی پروگرام بنا رہے تھے، لیکن جیب خالی تھی، اس لئے پروگرام سازی کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے، اب کیا پروا ہے ہمارے اسٹیٹ بنک کا گورنر ہمارے ساتھ چل رہا ہے —— تو تیار بھی ہو چکو کسی طرح!"

اس نئی مصیبت نے صفدر کو حواس باختہ کر دیا، اس نے سوٹ اُتار کر پھر ٹانگ دیا، محمود نے حیرت سے اس کی یہ حرکت دیکھی، اور پوچھا

"یہ کیا ——؟"

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا،

"اب نہیں جاؤں گا"

محمود نے پھر سوال کیا،

"کیوں نہیں جاؤ گے؟ کیا اس لئے کہ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں، اگر میری رفاقت تمہارے لئے باعثِ توہین ہے، لاؤ دس روپے دے دو،

(۲)

تین چار روز تک تو صفدر خاموشی کے ساتھ انتظار کرتا رہا صبیحہ کا

لیکن جب پانچواں، پھر چھٹا، پھر ساتواں دن بھی گذر گیا، تو اس کے دل میں اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا ہونے لگے، خیالات و توہمات نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا،

اس مصیبت سے گلو خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، کئی بار جی چاہا کہ ہمت کرے اور صبیحہ کے گھر چلا جائے ایک مرتبہ تو یہ سوچ کر بورڈنگ سے باہر بھی نکلا، لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا، سوچنے لگا،

لیکن صبیحہ خفا نہ ہو جائے کہیں بات بگڑ نہ جائے، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں،

جب اس حیص بیص میں آٹھواں دن بھی گذر گیا، تو صفدر کی حالت غیر ہو گئی، آج اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ نتیجہ خواہ کچھ ہو، اسے صبیحہ کے

وہ تو میں دیکھ رہا ہوں ———— ، ہمیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں
تم بیزار بیٹھے ہو ؛ لیکن میرے دوست اس طرح کام نہ چلے گا ، یا تو میری
دلچسپ باتوں سے اپنا جی بہلاؤ ورنہ پھر ———— دستِ جنوں
کو اپنے بڑھا جیب کی طرف !"

صفدر نے عاجز آ کر جیب میں ہاتھ ڈالا ، اور پانچ روپے کا ایک
نوٹ نکالتے ہوئے کہا

"اس وقت تو یہ ہے ؛"

محمود نے مشورہ دیا ،

"پانچ کسی سے قرض لے لو ، میرا کام بن جائے گا !"

صفدر نے نوٹ اس کے منہ پر پھینک مارا ،

"میں کسی سے قرض نہیں لیتا ، !"

محمود نے ایک اور تجویز پیش کر دی ،

"ناصر کے نام ایک چٹھی لکھ دو ، اس سے لے لوں گا ، وہ مجھے تو ایک
پیسہ نہیں دے گا ۔ تمہیں پانچسو روپے ماتھے پر شکن لائے بغیر دے دیگا !"

صفدر نے صاف انکار کر دیا ،

"اب تم جانتے ہو یا میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر دوں ؟"

صفدر نے جاتے ہوئے کہا ،

"جاتا ہوں بھئی ———— لیکن اگر تمہارے نام سے ناصر
یا کسی اور شخص سے دس روپے قرض نہ لے لوں تو میرا نام محمود کے

اور اکیلے چلے جاؤ، میں بعد میں خود ہی چلا جاؤں گا ؛

صفدر نے خشک سا منہ بنا کر کہا،

"میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے،"

اس جھوٹ پر محمود کیسے یقین کر لیتا،

"اچھا کھاؤ قسم !"

صفدر نے ذرا ترشی کے ساتھ کہا

"کیوں سر کھا رہے ہو ؛ ——— چلے جاؤ یہاں سے !"

محمود نے نہایت اطمینان سے کہا،

"لاؤ دس روپے "

صفدر کو غصہ آ گیا،

"اب جاتے ہو ؛ ——— "

"نکالو دس کا ایک خوب صورت سا نوٹ، پھر اگر کئی دن تک تمہیں صورت بھی دکھاؤں تو روسیاہ" !

اضمحلال اور افسردگی کے اس عالم میں بھی صفدر کو ہنسی آ گئی، اس نے التجا کے لہجہ میں کہا،

"خدا کے لئے معاف کر دو، ——— "

میری طبیعت بہت بد مزہ ہے اس وقت، تمہیں اپنے روپوں کی پڑی ہے"

محمود نے کہا،

(۳)

بعض واقعات ایسا اتفاقی رُخ اختیار کرتے ہیں، جن کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا، صبیحہ کی نسبت رقیہ نے اپنے بھائی کے لڑکے ساجد سے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، بلکہ سمجھنا چاہیئے کر بھی دی تھی، صرف باقاعدہ اعلان ابھی نہیں ہوا تھا کہ صبیحہ اور صفدر کے مابین مہر و محبت کے روابط پیدا ہوئے، بہت جلد ان دونوں کے روابط نے ذہین کے پلیٹ فارم پر مستحکم اور پائدار صورت اختیار کر لی، اور پھر وہ دن بھی آیا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کرنے لگے کہ ——— اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی،

اور کچھ ہی روز بعد ان دونوں نے ایک روز ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا، دونوں نے محبت کا اعتراف کیا، اور طے کر لیا کہ دُنیا کی کوئی طاقت ہمارے راستہ کا پتھر نہیں بن سکتی، !

بجائے منحوس رکھ دینا!"

صفدر مسکراتا ہوا آکر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا،

وہ دل ہی دل میں محمود کی اس ناوقت آمد اور مداخلت پر اُسے گالیاں دے رہا تھا، اور ٹھیک اس وقت ناصر کے سامنے صفدر کی طرف سے محمود نے دستِ سوال پھیلا رکھا تھا!

(۴)

رقیہ خانم نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے صبیحہ کو دیکھا اور پھر متبسم ہو کر کہا،

"بیٹی تو بھاوج سے نہیں ملی؟"

وہ رکھائی کے ساتھ بولی،

"مل لی"

رقیہ خانم اپنی خوشی میں اتنی مست تھیں کہ انہوں نے اس کے لب و لہجہ کی خشکی ذرا بھی محسوس نہیں کی، جوشِ مسرت سے بے قابو ہو کر کہا،

"کتنا چاہتی ہیں تجھے، جب سے آئی ہیں بس تیرے نام کی رٹ لگی ہے!"

صبیحہ کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں،

"ہاں معلوم ہے!"

پہلے پہل بادل نخواستہ بعد میں بڑی خوشی اور آمادگی سے دونوں نے اُسے قبول کر لیا۔ اس لئے کہ کسی کے سامنے بھی اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا، موجودہ حالات میں نہ ساجد کو صبیحہ سے اچھی دلہن مل سکتی تھی نہ رقیہ کے خیال میں ساجد سے اچھا شوہر صبیحہ کے لئے ڈھونڈا جا سکتا تھا

"قطعاً نہیں !"

رقیہ خانم ، اپنی لاڈلی ، چہیتی ، بے زبان ، اطاعت مند اور سراپا تسلیم و رضا بیٹی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر سکتہ میں آ گئیں ، چند لمحوں تک وہ نہ جنبش کر سکیں ، نہ اپنی جگہ سے ہل سکیں نہ کوئی لفظ منہ سے نکال سکیں پھر انہوں نے کہا ،

"کچھ ہوش میں ہے تو ؟"

وہ بولی ،

"اب تک تو ہوں ، لیکن اگر بار بار یہ باتیں میرے کان میں پڑتی رہیں تو شاید ہوش کھو دوں !"

لڑکی کا یہ رنگ دیکھ کر غصہ پر مصلحت غالب آئی ،

"بیٹی ، میری بچی ، کیا تو ہماری ناک کٹا دے گی ؟"

وہ کہنے لگی ،

"اس میں ناک کٹنے کی کیا بات ہے !"

"ارے بیٹی ہے کیسے نہیں ، ساری دنیا کو تو معلوم ہو چکا ہے ! کہ تیری شادی ساجد سے ہو رہی ہے !"

"اسی دنیا کو اب یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نہیں ہو رہی ہے ، ——— !"

"اور اگر ایسا ہوا تو کیا یہ ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہوگا ؟"

"میرے خیال میں تو ہرگز نہیں !"

اب تو رقیہ خانم کو خواب کی دُنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آنا پڑا۔

"میں دیکھ رہی ہوں تیری تیوریاں کچھ چڑھی ہوئی ہیں، بھاوج کے ذکر پر تیرے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے ——— اری پگلی وہ صرف تیری ممانی ہی نہیں ساس بھی ہیں!"

صبیحہ نے مچلتے ہوئے کہا،

"نہیں اماں جی!"

بیچاری اماں جی پر جیسے فالج گر پڑا۔

"کیا نہیں بیٹی!"

وہ بولی۔

"جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں، جو کچھ نہ چاہ رہی ہیں ———"

رقیہ خانم کا سارا بدن جو مرورِ ایام سے کافی دبیز اور جیم شحیم ہو گیا تھا، کانپنے لگا، انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا،

"یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟"

وہ گویا ہوئی،

"اماں جی میں غلط نہیں کہتی۔!"

رقیہ خانم کو غصہ آ گیا،

"یعنی یہ رشتہ تجھے منظور نہیں ہے؟"

بے جھجک صبیحہ نے جواب دیا۔

صبیحہ کی آواز نرم پڑ گئی، اس نے کہا،

"آخر آپ ڈرتی کیوں ہیں ممانی سے!"

وہ تقریباً روتی ہوئی بولیں،

نہیں بیٹی، ممانی تمانی کسی سے نہیں ڈرتی، میں تو اپنی اور اپنے گھر کی عزت سے ڈرتی ہوں حلق سے نکلی خلق میں پہنچی، اس بات کی بھنک بھی اگر پڑ گئی کسی کے کان میں، تو نہ جانے کیا ہو جائے گا!

نہایت اطمینان سے صبیحہ نے ماں کو یقین دلایا،

"بہر حال اس بات کو حلق سے نکل کر خلق میں پہنچنا ہی ہے، چاہے آج پہنچے، کل، یا پرسوں، پھر اتنی پردہ داری سے کیا حاصل؟"

رقیہ خانم نے فی الحال بحث کو لاحاصل سمجھتے ہوئے، بیٹی سے کہا،

"اچھا تم یہیں بیٹھی رہو، میں کہہ دوں گی لڑکی کے سر میں درد ہے اگر بھاوج یہاں آ جائیں تو ان سے اچھی طرح ملنا،

لیکن بھاوج کا بھلا دالان میں اکیلے بیٹھے بیٹھے کیا جی لگتا، وہ ٹبڈا ہاتھ میں لئے خراماں خراماں آ ہی گئیں!"

"نہ جانے تو نے کیا سوچا ہے!"

"میں نے وہی سوچا ہے جو ہو کر رہے گا!"

زندگی میں آج پہلی مرتبہ رقیہ خانم نے صبیحہ کا یہ رنگ دیکھا تھا، ان کی ہستی گم ہو گئی۔ ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی، کہ صبیحہ ایسا رویہ اختیار کرے گی، انہوں نے بڑی بے بسی کے ساتھ خود اسی سے مشورہ کیا،

"پھر اب کیا ہو گا؟"

صبیحہ نے جواب دیا،

"آپ ان سے معذرت کر دیجئے!"

رقیہ خانم کا تن بدن یہ سنکر جل اٹھا، بس میں ہوتا تو اس ذرا سی فتنی کا منہ سیل کے ٹانکے سے کچل دیتیں، لیکن مصیبت یہ تھی کہ کمرہ سے باہر دالان میں صفیہ بیٹھی اپنی ہونے والی بہو کا اشتیاق دیدار لئے بیٹھی تھیں، اگر ان کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی، ان باتوں کی، تو قیامت آجائے گی، بھائی بہن کا رشتہ قطع ہو جائے گا دونوں خاندانوں میں مستقل دشمنی کی داغ بیل پڑ جائے گی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تلخی اور بدمزگی کا نہ ختم ہونے والا دور شروع ہو جائے گا، صبیحہ نے یہ بات کہ ان سے معذرت کر دیجئے ذرا زور سے کہی تھی، رقیہ خانم نے غصہ ضبط کر کے التجا کے لہجہ میں کہا،

"اتنے زور سے تو نہ بولو!"

صفیہ بیگم نے ایک تجربہ کار حکیم کی طرح پہلے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، پھر اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ لے جا کر گلا ٹٹولا ۔ اس کے بعد نبض دیکھی اور نہایت اطمینان سے فیصلہ صادر کر دیا،

"ہاں ہے تو حرارت ۔"

صبیحہ کو ہنسی آگئی، لیکن اس نے ضبط کر لی

"نہیں ممانی بخار وخار کچھ نہیں ہے ———— اور اب تو سر درد بھی نہیں کر رہا ۔"

اپنی مہارت فن کی یہ توہین صفیہ بیگم نہ برداشت کر سکیں فرمایا :-

"آج کل کی لڑکیوں اور لڑکوں میں یہی تو عیب ہے کہ وہ بیماری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، نہ پرہیز کریں نہ دوا کریں ———— "

"دو تین دن جوشاندہ پی لو، طبیعت بالکل صاف ہو جائے گی"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"ہائے جوشاندہ ———— نہیں نہیں ۔"

صفیہ بیگم کو ہنسی آگئی،

"اے واہ جوشاندہ نہ ہوا زہر ہو گیا ۔"

رقیہ نے ٹوکا،

"واہ بھاوج خدا نہ کرے وہ کیوں زہر پینے لگی"

صفیہ بیگم پھر ہنس پڑیں،

"بہت چاہتی ہو اپنی بیٹی کو لیکن تمہاری تو نہ صرف بیٹی

(۵)

صفیہ بیگم نے نہایت اطمینان سے بٹوا کھولا، چھالیہ نکالی، اس میں لونگ تمباکو، الائچی اور بھنے ہوئے ناریل کے سوندھے ٹکڑے ڈالے، پھر منہ میں پھنکا مارنے کے بعد چھوٹی کھولی، ایک انگلی میں کتھے کا لوندا، دوسری میں چونا لگایا، پہلے کتھے والی انگلی منہ میں رکھ کر اس طرح چوسی، جیسے نہایت شیریں آم، پھر چونے والی انگلی منہ میں رکھ کر جلدی سے باہر نکالی، پھر اس مجموعہ کو ایک دائرہ سے دوسرے دائرہ کی طرف منتقل کیا، اس کے بعد فرمایا۔

"کیوں بیٹی تم تو یہاں بیٹھ رہیں، میں وہاں تمہارے انتظار میں بیٹھی سوکھ رہی تھی۔"

صبیحہ سے پہلے ہی رقیہ نے جواب دیا۔

"جب سے آئی ہے سر میں درد ہو رہا ہے بیچاری کے۔"

انہوں نے حیرت، برہمی، حقارت اور نفرت کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اس خود سر باغی اور بے غیرت ڈکی پر ایک نظر ڈالی، پھر اپنا بٹوا سنبھالا، اور چپ چاپ آکر اسی دالان میں جہاں سے وہ اپنی ہونے والی بہو کا دیدار کرنے کے لئے اُٹھی تھیں، واپس تشریف لے آئیں — —— اُن کی آنکھوں میں دُنیا تاریک ہو رہی تھی!!

ہے، میری بیٹی بھی ہے اور بہو بھی، میرا تو دوہرا رشتہ ہوا"

یہ سن کر صبیحہ کی تیوریاں چڑھ گئیں، رقیہ سمجھ گئیں کہیں اس نے کچھ کہہ دیا تو غضب ہو جائے گا، انہوں نے باہر جاتے ہوئے کہا،

"یہاں تو دم الجھ رہا ہے، آؤ باہر بیٹھیں ہوا میں۔"

رقیہ خانم جب دروازہ پر پہنچ گئیں تو صفیہ کی آواز آئی،

"تم چلو میں آئی!"

اب رقیہ کے لئے نہ جانے ملہ دن زبانے رفتن والا معاملہ تھا صبیحہ پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر چلی گئیں بیچاری،

ان کے جانے کے بعد صفیہ نے کہا

"کیوں بیٹی بھلا اس شاندار گھر، اس آزادی، اس ماحول کو چھوڑ کر ہمارے ہاں تمہارا جی کیسے لگے گا؟"

صبیحہ نے کہا،

"بالکل نہیں لگے گا،!"

صفیہ نے کہا،

"لیکن زندگی تو تمہیں وہیں بسر کرنی ہے!"

صبیحہ نے تند نظروں سے صفیہ کو دیکھا

"جی نہیں،!

جی نہیں ایک لفظ نہیں بم کا گولہ تھا، نہیں ایٹم بم تھا جس نے ہماری صفیہ بیگم کے ہیروشیما یعنی حصار قلب و دماغ کے پرخچے اڑا دیئے

(۶)

جس وقت صفیہ بیگم واپس آکر پھر دالان میں تخت پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر یاد سی اور برہمی کے عالم میں بیٹھیں اس وقت رقیہ اور نعیم میں جھوڑ ہو رہی تھی، وہ اپنے بے پروا اور لا اُبالی شوہر سے کہہ رہی تھی۔

"مبارک ــــــــ"

نعیم نے دفتر جانے کے لئے اچکن پہنتے ہوئے کہا،

"کون سی خوشخبری لائی ہو بھئی،"

رقیہ نے طنز سے بھرا ہوا جواب دیا۔

"صاجزادی ہاتھ سے گئیں!"

نعیم نے حیرت سے رقیہ کی طرف دیکھا،

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

رقیہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، یہ رنگ دیکھ کر نعیم نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا،

"آخر بات کیا ہے؟"

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی،

"حبیبہ نے انکار کر دیا!"

"کس چیز سے بھئی!"

"شادی سے ——— وہ ساجد سے شادی نہیں کریگی یہ اس کا فیصلہ ہے!"

نعیم نے ایک قہقہہ لگایا،

"تو اس میں اس قدر پریشان اور مضطرب ہونے کی کیا بات ہے؟ ——— نہ کرے ہم بھی زبردستی نہیں کریں گے ———!"

رقیہ نے خونخوار نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا،

"لیکن صفیہ بیگم تو نسبت پختہ کرنے آئی ہیں، مٹھائی بھی ساتھ لائی ہیں!"

نعیم نے بے پروائی سے کہا،

"تو کیا ہوا مٹھائی کھانے سے تو نہ مجھے انکار ہو سکتا ہے، نہ تمہیں میرے خیال میں تو حبیبہ بھی شوق سے کھائے گی، وہ تو مٹھائی کے نام پر گڑ بھی شوق سے کھا لیتی ہے!"

رقیہ خانم کے لئے اب ضبط کرنا مشکل ہو گیا،

"ہاں کیوں نہیں؛ ———— کہو تو ابھی چل کر کہہ دوں؛ جھگڑا تو چکے ———— !"

رقیہ خانم سہم گئیں۔

"خدا کے لئے ابھی کچھ نہ کہنا، !"

نعیم نے بیوی کے مشورہ کے آگے سر جھکا دیا،

"خیر اس وقت نہ سہی، کل سہی، پرسوں سہی لیکن بات صاف ہو جانی چاہیئے، گومگو کا عالم زیادہ دیر تک میں قائم نہیں رکھنا چاہتا!"

رقیہ کا جی چاہا، خوب چیخ چیخ کر رو دے، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا ———— نعیم صاحب دفتر روانہ ہو چکے تھے،

"بھاڑ میں جائیں تمہاری یہ باتیں، انہی باتوں سے تو وہ ہاتھ سے بے ہاتھ ہوتی ہے، میرے منہ پر، تو اُس نے کالک لگا دی، تم بھی رو سیاہ ہو گئے، میں غیرت سے مری جا رہی ہوں تم ہنس رہے ہو ——————— نہ جانے کاہے کا دل بنا ہوا ہے تمہارا ——————— !"

نعیم نے پھر ایک دل شکن قہقہہ لگایا،

"نہیں بیگم تمہارا چہرہ چاند کی طرح روشن ہے اور اسی طرح رہے گا! جب تک میں زندہ ہوں اس پر کالک نہیں لگ سکتی، یہ اسی طرح روشن اور اور تابناک رہے گا۔"

بے بسی کے ساتھ رقیہ نے پوچھا،

"تو کیا تم نے صبیحہ کی سرکشی پر صاد کر دیا!"

"ظاہر ہے، اگر وہ ساجد کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی تو کیوں اسے مجبور کیا جائے، یہ اس کی زندگی کا معاملہ ہے، اس معاملہ میں اس کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔"

"لیکن صفیہ بیگم کو کیا جواب دو گے؟"

"کہہ دیں گے یہ رشتہ نہیں ہو سکتا!"

"اگر انہوں نے دریافت کیا کیوں؟ تو کیا جواب دو گے؟"

"کہہ دیں گے، صبیحہ اسے پسند نہیں کرتی۔"

"ہائے میرے اللہ، یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکل سکیں گے؟ تم یہ کہہ سکو گے؟"

ہی نفرت کرنے لگی تھیں، جتنی نیولا سانپ سے کرتا ہے، لیکن اللہ رے رکھ رکھاؤ کیا مجال ہے جو ایک لفظ بھی منہ سے ایسا نکالا ہو جس سے رقیہ کو ان کے عندیہ کا اندازہ ہو سکے، یا چشم و ابرو سے وہ ان کے خیالات کا اندازہ کر سکے،

صبیحہ کا جہاں تک تعلق تھا وہ اپنے کمرہ میں گوشہ نشین تھی ناشتہ بھی یہیں آجاتا، کھانا بھی یہیں کھا لیتی، اور دن بھر بیٹھی یا لیٹی کتابیں پڑھتی رہتی، نہ رقیہ میں یہ ہمت تھی کہ اسے باہر بلائیں، نہ صفیہ کو اس کی ضرورت تھی کہ اس کے پاس آئیں، انہی اس کیفیت نہاں کو چھپانے کے لئے انہوں نے خود چادر اوڑھ کر بستر پر قبضہ کر لیا تھا کہ ———— وہی دیرینہ بیماری، وہی ناکلمی دل کی ———— یعنی اختلاج قلب کی شکایت ہے اطمینان سے اپنے خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا بہ نسخہ خاص، خمیرہ گاؤزبان عنبری، جواہردار، دواالمسک معتدل جواہر والی جاٹا کرتی تھیں، عرق گلاب، عرق بیدمشک، ہمتنرادا یہ لذیذ اور خوشگوار دوائیں کوئی شکایت نہ ہو تب بھی ذائقہ کام و دہن کے لئے ایک نعمت ہیں؛ اور ان سے تفریح و تقویت قلب حاصل ہوتی ہے، اس طرح ان کے لیٹ جانے سے رقیہ کے دل میں یہ خیال بھی نہیں پیدا ہوا کہ یک بیک انہوں نے صبیحہ کا چاؤ پیار کیوں ترک کر دیا؛ البتہ ڈرتے ڈرتے صبیحہ کے کمرہ میں پہنچیں وہ اس وقت بھی کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھی، ماں کو آتا دیکھ کر اس نے کتاب ویسے ہی کھلی چھوڑی اور منتظر نظروں سے ان کی طرف دیکھنے

(۷)

صبیحہ کا طرزِ عمل سارے گھر کے لئے ایک لاینحل معمہ بن گیا تھا اتفاق کی بات دیکھے، دن نعیم صاحب اپنے اخبار کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے، غیر ملکی صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ تین دن کے دورہ پر روانہ ہو گئے، لہٰذا وہ کوئی عملی حصّہ اس اہم ترین معاملہ میں نہ لے سکے، انیسہ خانم اتنی سہم گئی تھیں کہ کوئی بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتی تھیں، نہ جانے وہ کیا کہیں اور صبیحہ کیا جواب دے، اور یہ جواب کیسا طوفان کھڑا کر دے، صبیحہ بیگم کی پالیسی یہ تھی کہ پانی دیکھا جاتے، پانی کی دھار دیکھی جاتے بجائے اس کے کہ وہ خود نسبت منقطع کر کے سارا الزام اپنے اوپر لیں کیوں نہ انہیں لوگوں کو انکار کا موقع دیں، تاکہ الزام جو کچھ آتے وہ انہی لوگوں پہ آتے، یہی وجہ تھی کہ گو انہوں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ، صبیحہ ان کی بہو بننے کی مستحق نہیں ہے، اور گو اب وہ اس سے اتنی

لگی، رقیہ خانم پاس آ کر بیٹھ گئیں، اور اپنی حالت پنہاں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اُنہوں نے لرزتی آواز میں کہا،

"کل سے بھاوج (صفیہ بیگم) کی طبیعت خراب ہے!"

صبیحہ نے پُوچھا،

"کیا خراب ہے؟"

وہ بولیں،

"دھڑکن کی ــــــــــ کسی طرح کی دوائیں چاٹ رہی ہیں لیٹے لیٹے"

گویا یہ کوئی اہم بات ہی نہیں اُس نے کہا،

"وہ تو بہت دنوں سے اس بیماری میں مبتلا ہیں، اور سچ پوچھئے تو یہ کوئی بیماری بھی نہیں!"

رقیہ خانم جل گئیں، انہوں نے تیکھے لہجہ میں کہا،

"نہ ہوگی ــــــــــ اگر تم ذرا انہیں پُوچھ آؤگی تو کون سی قیامت آجائے گی، آخر وہ کوئی غیر تو نہیں، اپنی ہی ہیں!"

صبیحہ نے جواب دیا۔

"میری خود طبیعت خراب ہے، اسی لئے تو کمرہ سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے میں نے!"

رقیہ بیگم نے سمجھ لیا، ان تلوں میں تیل نہیں نکل سکتا، اگر ان کے بس میں ہوتا تو چار چوٹ کی مار اس سرکش، اور باغی لڑکی کو مارتیں لیکن اپنے برابر کی لڑکی تھی، مار تو بڑی چیز ہے، ایک لفظ بھی منہ سے نکالتیں تو اور لینے کے دینے پڑ جاتے چپ چاپ اٹھیں اور صفیہ کے پاس آکر خاموش و مضمحل بیٹھ گئیں۔

سرورونشاط

اے فلک رشک سے نہ جل مرنا
بچھڑے ملتے ہیں آج مدت کے

(۱)

دس دن گزر گئے!!

صفدر کو یہ دس دن ایک صدی سے زیادہ طویل معلوم ہوئے، ہر روز وہ آس لگاتا تھا، آج صبیحہ ضرور آئے گی، ہر روز اُسے مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا تھا صبیحہ کی اس غیر حاضری نے اُسے نہ جانے کیسے کیسے وہموں میں مبتلا کر دیا تھا، بار بار ارادہ کرتا کہ اس کے گھر چلا جائے لیکن ہمت نہ پڑتی، کبھی سوچتا خط لکھ کر گھر کے پتہ سے بھیج دے، پھر اندیشہ ہوتا نہ جانے کس کے ہاتھ میں پڑے اور حالات زیادہ نازک اور پیچیدہ صورت اختیار کر لیں، کبھی خیال آتا کسی اور کو اپنی طرف سے وہاں ٹوہ لینے کے لئے بھیجے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس تجویز کو رد کر دیتا، اس میں بھی قباحتیں اور مشکلیں تھیں!!

آخر ایک روز مایوسی کے تاریک بادل چھٹ گئے، اور امید کا سورج

طلوع ہوا،

صبیحہ مسکراتی ہوئی اُسے نظر آئی،!

کتنی رونق تھی آج اس کے چہرۂ گل رنگ پر کتنی مسرور نظر آ رہی تھی آج وہ اس کی نشاط و سرخوشی کا آج وہ عالم تھا، جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، صفدر بے تابانہ اس کی طرف لپکا،

"صبیحہ تم آگئیں!"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"ہاں میں آگئی!"

پھر اس نے صفدر کی طرف دیکھا اور سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی،

"کیا آپ بیمار تھے کچھ؟"

صفدر نے جواب دیا۔

"نہیں تو،!"

اس نے اسی اضطراب انگیز لہجہ میں کہا،

"پھر یہ آپ کی حالت کیا ہو رہی ہے؟"

صفدر نے اطمینان دلایا،

"کچھ بھی تو نہیں صبیحہ!"

لیکن صبیحہ اس کھوکھلے دعوے کو کیسے تسلیم کرتی؛

"کیا میں دیکھ نہیں رہی ہوں؟"

صفدر نے پوچھا،

"کیا دیکھ رہی ہو صبیحہ؟"

وہ بولی،

"جیسے بہت دنوں کا بیمار آپ کی یہ حالت دیکھ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں، چہرہ اُترا ہوا، آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، خدا کے لئے چھپائیے نہیں حالت بتا دیجئے، آپ بیمار ہیں ——— ؟"

صفدر نے پھر اطمینان دلایا

"کوئی بیماری نہیں ہے ——— مگر ہاں بیماریٔ دل تم دو تین بعد واپس آنے کا وعدہ کر گئی تھیں، لیکن دس دن گذر گئے تمہارا روئے زیبا دیکھنے کو آنکھیں ترستی رہیں دل میں طرح طرح کے پریشان کن خیالات آتے تھے، واقعی صبیحہ میں ادھ موا ہو گیا، مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی، تم کس حال میں ہو؟ تم پر کیا گذر رہی ہے؟ کہیں خدانخواستہ کسی مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہو گئیں؟ تشدد اور استبداد کا شکار تو نہیں بن گئیں ——— صبیحہ بتاؤ کیا ہوا۔؟"

وہ ہنسنے لگی،

"آدمی کو اتنا وہمی بھی نہیں ہونا چاہیئے!"

"اچھا میں اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہوں، یہ بتاؤ کیا گذری؟"

"خیریت ہے سب، اور آپ کی خیریت بدرگاہ رب العزت مطلوب ہے"

"پھر وہی مذاق!!"

"اب بھی آپ نہیں سمجھے؟"

"نہیں جب تک تم صاف الفاظ میں نہیں بتاؤ گی، میں کچھ نہیں سمجھ سکوں گا!"

صبیحہ نے صفدر سے رخصت ہو کر گھر پہنچے، وہاں صفیہ بیگم سے ناگہانی طور پر ملنے، رقیہ خانم کے غصہ کرنے، ادوں سے اپنی اکڑی اکڑی باتیں کرنے کی ساری روداد بیان کرنے کے بعد اس نے کہا،

"پھر ابا جی دورہ سے واپس آتے ہیں نے انہیں خط لکھ کر ملازمہ کے ہاتھ بھیج دیا۔!"

"خط بھیج دیا؟ ——————— کیا لکھا تھا اس میں؟"

"(مسکرا کر) وہی تو بتانے جا رہی تھی، مگر آپ سنیں بھی!"

"اچھا اب کوئی مداخلت نہیں کروں گا!"

"میں نے ابا جی کو لکھا ساجد بھائی، یقیناً اچھے اور شریف آدمی ہیں لیکن صفدر صاحب ہزار گنا زیادہ اچھے اور شریف آدمی ہیں مجھے ساجد بھائی سے کوئی لگاؤ نہیں لیکن صفدر صاحب ایسے آدمی ہیں کہ دشمن بھی ان سے محبت کرنے پر مجبور رہیں، ساجد صاحب کے ساتھ اگر مجھے زندگی گزارنا پڑی تو رو رو کر گزرے گی، صفدر صاحب کے ساتھ اگر مجھے زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملا تو ہم دونوں کی زندگی بن جائے گی، صفدر صاحب نے کئی بار آپ سے ملنا چاہا لیکن میں نے انہیں روک دیا، میں نے کہا آپ کو ان سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں، میرے ابا جی، میری مرضی کے خلاف نہیں کریں گے، وہ اماں جی سے بھی زیادہ مجھے چاہتے ہیں، ابا جی نے یہ

خط پڑھا، اور صفیہ ممانی کے پاس جا کر بیٹھے، اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہیں، خود ابا جی نے معذرت کر دی کہ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا! ـــــــ دیکھئے اسے کہتے ہیں دیر آید درست آید، مجھے آنے میں دیر تو ہوئی، لیکن کتنی اچھی خبر اپنے ساتھ لائی، اب بھی آپ یونہی افسردہ رہیں گے؟"

---

(۲)

صفدر خاموشی کے ساتھ صبیحہ کی باتیں سنتا رہا، اتنی ذرا سی دیر میں اس کی حالت حیرت ناک طور پر بدل گئی تھی، وہی ملول و افسردہ چہرہ اس وقت رعنائی اور تازگی میں اپنی مثال آپ تھا، اس وقت وہ اتنا شادماں نظر آ رہا تھا، جیسے اُسے کوئی غم تھا ہی نہیں، اس نے کہا،

"واقعی یہ بہت بڑی خوشخبری ہے ——— لیکن اب؟"

صبیحہ نے ناز و انداز کے ساتھ ماتھے پر شکن ڈال کر کہا،

"اب کیا؟"

وہ کہنے لگا،

"کیا تمہارے والد سے اب میں ملوں گا؟"

وہ بولی،

"جی ہاں اُنہوں نے آپ کو بلایا ہے، ضرور ملنا پڑے گا اب تو!"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا صبیحہ نے دریافت کیا،

"کہاں چلے؟"

وہ بولا،

"تو جاؤں مل آؤں پھر؟!"

صبیحہ ہنسنے لگی،

"آپ بھی عجب آدمی ہیں ———— ابھی؟ ———— اسی وقت ————؟"

وہ اس طرح بیٹھ گیا، جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر،

"پھر کب؟"

صبیحہ نے ہنستے ہوئے کہا،

"کل جائیے گا، چار بجے سہ پہر کو، وہ آپ کو گھر ملیں گے!" ———— انہوں نے یہی وقت دیا ہے!"

گویا یہ ایک دن کاٹنا صفدر کے لئے ہفت خواں کی منزل طے کرنے سے کم نہیں، اس نے بجھے ہوئے دل سے کہا،

"اچھا کل ہی سہی"

صبیحہ پھر ہنسنے لگی

"دیکھئے اللہ میاں ہم پر کتنے مہربان ہیں؟"

صفدر نے تائید کی،

"ہاں اور کیا!" ———— بہت زیادہ!" ————

صفدر گھبرا گیا،

"کیا تمہیں اعتراض ہے کچھ ؟"

وہ بولی،

"میرا جہاں تک تعلق ہے، میری مرضی وہی ہے جو آپ کی مرضی ہو لیکن یہ ایسی بات ہے جس میں حصّہ لینا میرے لئے ممکن نہیں، آپ جانیں اور اباجی!" ———— لیکن بہرحال وہ تاریخ امتحان کے بعد ہی ہونی چاہیئے۔"

صفدر نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا،

"ہاں بھئی ہاں ———— امتحان میں فیل ہونا تو میں بھی نہیں چاہتا ———— !"

دونوں پھر ہنسنے لگے،

پھر کچھ سوچتے ہوئے صبیحہ نے کہا،

"آخر آپ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے لئے کیوں ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟"

"کیا مطلب ؟"

"جو بات ہو، اسی وقت ہو، فوراً ہو،"

"(ہنستے ہوئے) بھائی ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے یہ جلدبازی واقعی کچھ میری فطرت سی بن گئی ہے ———— بہرحال اب تو میں تمہارے قبضہ میں ہوں، میری اصلاح بھی تمہی کو کرنا پڑے گی ———— اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میرے رنگ میں رنگ

لیکن ایک بات تو بتاؤ! تمہاری صفیہ ممانی اس فیصلہ سے جز بز تو بہت ہوتی ہوں گی؟"

صبیحہ نے بتایا

"وہ تو آسمان سر پر اٹھا لیتیں، لیکن میرے طرزِ عمل نے انہیں اتنا مایوس اور دل برداشتہ کر دیا تھا کہ اس فیصلہ کو انہوں نے سکون کے ساتھ سنا بیچاری سوچ رہی ہوں گی، جب ابھی سے اس لڑکی کے یہ لچھن ہیں تو اگر کہیں یہ میری بہو بن کر آئی تو نہ جانے کیا غضب ڈھائے! اچھا ہے بلا ٹلی میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ابا جی انکار نہ کرتے تو شاید وہ خود ہی معذرت کر دیتیں ————!"

صفدر نے یہ سن کر ایک قہقہہ لگایا،

"بھئی خوب بات کی، واہ!"

پھر وہ گویا ہوا۔

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جیت گئے!"

صبیحہ نے کہا،

"اب بھی کچھ شک ہے آپ کو؟"

وہ کہنے لگا،

"انشاءاللہ کل کی ملاقات میں تاریخ کا تعین بھی ہو جائے گا،!"

اس بات سے دلچسپی کا کوئی اظہار صبیحہ نے نہیں کیا

"آپ جانیے!"

جاؤ ——— !"

صبیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"جی بخشئے ——— میں خود اپنا رنگ رکھتی ہوں، یہ رنگ نہ کسی سے میل کھاتا ہے، نہ کسی میں جذب ہوتا ہے!"

صفدر نے فخر کے لہجہ میں کہا،

"میں جانتا ہوں صبیحہ تم کیا ہو؛ ——— عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں؟"

سوزِ حیات

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

(۱)

دفعتاً وبا پھوٹ پڑی !

شہر میں کم اور دیہات میں زیادہ ، دو چار کیس شہر میں بھی ہوئے لیکن آس پاس کے دیہاتوں میں تو جنگل کی آگ کی طرح یہ وبا پھیل گئی ہر روز نہ جانے کتنی موتیں ہوتیں، لوگ سسک رہے تھے، تڑپ رہے تھے - ایڑیاں رگڑ رہے تھے اور مر رہے تھے !

شہر کے حکیموں اور ڈاکٹروں کو سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی ، صبح سے لے کر، رات کے گیارہ بارہ بجے تک مطب میں مجمع لگا رہتا ، پھر بیچ بیچ میں بڑے مریضوں کے گھر پر "وزٹ" الگ ، یہی حال اسپتالوں کا تھا ، تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ، لیکن مریض تھے کہ زمین سے ابلے پڑ رہے تھے -

سب سے زیادہ نازک حالت موضع سلام پور کی تھی ، ایسا معلوم

بڑے ملحد اور دہریے، شرابی اور جواری، زانی اور عیاش پابندی سے نماز پڑھنے لگے تھے، بعض بعض نے تو تہجد تک کی پابندی اختیار کر لی تھی، وہ سفاک اور سنگدل جن کی فطرت میں ظلم شامل تھا، اب اتنے رحم دل ہو گئے تھے کہ خوف خدا سے ہر وقت آنکھیں تر رہتیں، عذاب جہنم کا ذکر آیا اور ان کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہوئی، بعض پہلے کے ظالم اور رمال کے رقیق القلب لوگ تو ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگتے۔

ہوتا تھا وبا کا سرچشمہ یہیں سے پھوٹا ہے، چند ہی روز میں ضلع کا بڑا حصّہ، موت کے گھاٹ اتر گیا۔ دیہاتوں میں وبا یہیں سے پھیلی اور بہت جلد اس نے تمام متصلہ دیہاتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اک آگ تھی جس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، جس نے لوگوں کے خرمن حیات کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا، نہ بڑے کی تمیز تھی، نہ چھوٹے کی، نہ مرد کی نہ عورت کی، نہ بوڑھے کی نہ جوان کی، نہ بچے کی، نہ تندرست و توانا کی، نہ کمزور و نحیف کی، جو زد میں آیا، وہ دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو گیا، صبح کو ران میں یا گردن میں گلٹی نمودار ہوتی، دوپہر تک بخار میں بدن تپنے لگتا، تھوڑی دیر کے بعد سرسامی اختیار کر لیتا، اور رات کو کسی وقت مریض ختم ہو جاتا، کوئی ایسا خوش نصیب ہوگا، جو دو چار دن زندہ رہتا ہوگا، لوگ بھاگ بھاگ کر ایک دیہات سے دوسرے دیہات میں جاتے لیکن جہاں بھی جاتے موت ان کا تعاقب کرتی ہوئی پہنچتی اور انہیں جا لیتی، پندرہ دن کی مختصر سی مدّت میں نہ جانے کتنی عورتوں کا سہاگ لٹ گیا، نہ جانے کتنے بچے یتیم ہو گئے، نہ جانے کتنے گھروں میں خاک اڑنے لگی، نہ جانے کتنے آباد، بارونق اور چہل پہل والے گھر ویران بن گئے، جہاں سے کوئی صدا بلند نہ ہوتی —— ماتم تک کی نہیں۔

وبا کی اس شدّت نے ہر شخص کو ہراساں اور سراسیمہ کر دیا تھا، زندگی ناپائدار کا جتنا یقین اب لوگوں کو ہو گیا تھا، کبھی نہیں تھا، بڑے

(۲)

قومی کالج کا ہال، طلبہ اور طالبات سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، ڈاکٹر شاکر ڈائس پر رونق افروز ہیں، سرخ و سفید چہرہ، بلند و بالا قد، کشش آفرین اور سحر انگیز آنکھیں، شخصیت دلفریب، انداز و اطوار میں عظمت بھی اور وقار بھی، ڈاکٹر صاحب کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا، ان کے ہونٹوں پر ہر وقت تبسم کھیلتا رہتا تھا، لیکن رعب اور وجاہت کا یہ عالم کہ آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بات کرنا ناممکن، کالج میں ڈاکٹر صاحب کی دل آویز شخصیت، کردار، و سیرت کا نہایت شاندار نمونہ تصور کی جاتی تھی —— لیکن آج ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر اضطراب و تشویش کے آثار ہویدا تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا کوئی خاص بات ہے جس نے انہیں بے چین اور مضطرب کر رکھا ہے، لوگ حیران ہیں کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسا شخص، جو طوفانوں کا مسکرا مسکرا کر مقابلہ کرتا ہے، جو کسی کو خطرہ میں نہیں لاتا، جس کے نزدیک

ہر غم اس لئے ہے کہ تبسّم ہو کر اس کا خیر مقدم کیا جائے، ہر آفت اس لئے ہے کہ خندہ جبینی سے اس کا استقبال کیا جائے، آج اتنا دل گرفتہ، شکستہ خاطر اور ملول کیوں نظر آرہا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد جلسہ شروع ہوا، قرأت قرآن سے کارروائی کا آغاز ہوا، اس کے بعد، ڈاکٹر شاکر، پیکر رنج دمن نے اسٹیج پر تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

میرے عزیزو!

آج میں تم سے رخصت ہونے آیا ہوں، شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شہر کے رہنے والے اس ہولناک مصیبت کا اندازہ نہیں کر سکتے، جو وبا کی صورت میں اطراف کے دیہات کو اپنا نشانہ بنا رہی ہے، یہ وبا نہیں آگ ہے جسکے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، جس کے شعلوں میں لوگ بھسم ہو رہے ہیں، کوئی ایسا نہیں جو ان کو موت کے پنجہ سے چھڑا سکے، کوئی ایسا نہیں جو اپنی زندگی خطرہ میں ڈال کر ان کی سیوا کر سکے، کوئی ایسا نہیں جو اپنے مشغلوں سے کنارہ کش ہو کر دیہاتوں کے ان بدنصیب اور لب مرگ لوگوں کی مدد کر سکے۔

لوگ مر رہے ہیں۔ عورتوں کا سہاگ لٹ رہا ہے، بچے یتیم ہو رہے ہیں، گھروں کی رونق اور آبادی ویرانی اور سناٹے سے بدل رہی ہے، گھر ویران ہو رہے ہیں، قبریں آباد ہو رہی ہیں، مگر اسلام کے وہ پرستار کہاں ہیں جنہیں اپنے مذہب پر اپنے اکابر پر، اپنی

تاریخ پر ناز ہے آج وہ کہیں نظر نہیں آتے، ورنہ میں ان سے پوچھتا
کہ تمہارا دین انسانیت کا دین ہے اگر آج انسانیت موت و ذلیت کی
کشمکش میں مبتلا ہے اور تم فکرِ عافیت میں ؛ میں ان سے دریافت کرتا
تمہارے اکابر کے احوال و سوانح سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے
کہ انہوں نے اپنی زندگی خطرہ میں ڈال کر اپنے ابنائے جنس کی خدمت
کی۔ مگر آج تم ان آشفتہ حالوں کے حال پر توجہ نہیں کرتے، جو ایڑیاں رگڑ
رگڑ کر مر رہے ہیں، ان سے مجھے معلوم کرنا تھا کہ اپنی تاریخ میں تم نے
اپنی ملتِ مرحومہ کے جن شاندار کارناموں کو پڑھا ہے کیا وہ اسی لئے ہیں
کہ انہیں پڑھو اور بھول جاؤ ؟

آج تمہارے ابنائے جنس اس لئے مر رہے ہیں کہ کوئی ان کی خبر
لینے والا، تیمارداری کرنے والا، خدمت کرنے والا نظر نہیں آتا، اس طرح
مر رہے ہیں کہ قبر کھودنے والوں کو فرصت نہیں، جنازہ میں شرکت کرنے
والے اعزاد اقربا و احبا خود ہی موت کے دستِ زبردست کی گرفت
میں ہیں، آبادیاں ویران ہو رہی ہیں، دیہات اجڑ رہے ہیں مگر کوئی نہیں
جو ان کی خبر لے جو ان کی مدد کرے، جو ان کی خدمت پر آمادہ ہو،
اپنی زندگی کسے عزیز نہیں ہے مجھے بھی ہے اپنے بال بچوں کے
حال و مستقبل کی پروا کسے نہیں ہوتی ؛ مجھے بھی ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے
محبت کون نہیں کرتا ؛ میں بھی کرتا ہوں لیکن عزیزو ہم میں سے کون
نہیں جانتا کہ یہ زندگی ایک غیر یقینی حادثہ ہے آدمی ہر وقت مر سکتا ہے

خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا، امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، پھر میں زندگی مستعار کے بدلے حیات پائدار کیوں نہ حاصل کروں؟ موجودہ حالات میں زندگی میرے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے، زندہ رہتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے، میں اس زندگی کو جو مجھے حاصل ہے اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا ہوں، میں نے چند خدا ترس ڈاکٹروں اور نرسوں کو خدمت خلق پر آمادہ کر لیا ہے، ان کے ساتھ میں بھی دیہات دیہات پھروں گا، اور دکھی لوگوں کی خدمت کروں گا۔ اور اس راہ میں موت کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوشی محسوس کروں گا، مر جاؤں گا مگر اس موت پر فخر کروں گا،

؎ جان دی ——— دی ہوئی تھی اس کی تھی،
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا،

میرا جی چاہتا تھا کہ تمہیں بھی دعوتِ عمل دیتا، لیکن نہیں یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے، میں کسی سے کچھ نہیں کہتا، تم خود عاقل اور بالغ ہو، تم میں سے ہر شخص کو خود اپنا فرض محسوس کرنا چاہیئے،!

یہ کہہ کر ڈاکٹر شاکر بیٹھ گئے، کئی لڑکوں اور لڑکیوں نے ڈاکٹر صاحب کو گھیر لیا اور ان کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا ——— اس گروہ میں سب سے پیش پیش، اصغر اور صبیحہ تھے!

ڈاکٹر شاکر کا اصول زندگی یہ تھا کہ وہ وعظ و نصیحت کے زیادہ قائل نہ تھے، نازک سے نازک موقع پر خود کود پڑتے تھے، پھر دوسروں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا کہ وہ بھی اس عمل صالح کی پیروی

کریں ۔ ڈاکٹر ٹ کرنے خطرہ سے الگ رہ کر خطرہ قبول کرنے کی دعوت کبھی نہیں دی، بڑے سے بڑے خطرہ میں کود کر لوگوں کے سامنے صراطِ مستقیم رکھ دی ۔

انجام

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(۱)

ڈاکٹروں نرسوں اور قومی کالج کے طلبہ اور طالبات کی ایک جماعت کے ساتھ ڈاکٹر اشا کر دیہات دیہات کا چکر لگا رہے تھے، جہاں سنتے کہ آگ بھڑک رہی ہے، اپنے جاں نثار اور وفادار ساتھیوں کے ساتھ اپنی جان سے بے پروا پہنچتے اور خدمت میں لگ جاتے، وہ اور ان کے ساتھی مریضوں کے انجکشن لگاتے، ان کے لئے کھانا پکاتے، رات رات بھر جاگ کر انکی تیمارداری کرتے، ان کا پاخانہ پیشاب تک آٹھاتے اور یہ سب کچھ اتنی خندہ پیشانی، مستعدی اور محبت سے کرتے کہ کیا کوئی پشتینی نوکر کریگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا، یہ لوگ کھانا تک اپنا کھاتے تھے، یہاں کے حالات سدھرے تو دوسرے گاؤں میں پہنچ گئے، وہاں کی حالت قابو میں آئی تو تیسرے دیہات میں خیمہ لگادیا، وہاں سے ذرا فارغ ہوئے تو کسی اور جگہ پہنچ گئے، دن ہو یا رات یہ اپنی دھن

میں مست تھے ——— درد جس دل میں ہو، اس دل کی دوا بن جاؤں —
——— ! ان میں سے ہر ایک میں ڈاکٹر شاکر کے فیضِ صحبت نے، ان کی
بلند سیرت اور باعظمت کردار نے جو جذبہ پیدا کر دیا تھا، وہ ایک اور
صرف ایک تھا ——— پیری و ضعیفوں کے سہارے کو عصا بن جاؤں!

ساتھ کے ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی ڈاکٹر شاکر اور ان کے تربیت یافتہ
طلبہ کے جوشِ خدمت، بے لوثی، بے نفسی اور جذبۂ ایثار پر حیرت ہوتی
یہ لوگ جب آپس میں بیٹھتے تو ان کا موضوعِ گفتگو صرف ڈاکٹر شاکر اور
ان کے طلبہ ہوتے! انہیں حیرت ہوتی کہ ڈاکٹری ہمارا پیشہ ہے، مریضوں
کی خدمت اور تیمارداری ہمارا فریضہ ہے، لیکن ہم اپنے پیشہ میں اتنے
چوکس اور اپنے فریضہ کی بجا آوری میں اتنے مستعد نہیں، جتنے یہ فنِ علاج
سے بے بہرہ اور ناواقف لوگ۔ ہم آرام بھی کرتے ہیں، کھانا بھی کھاتے
ہیں، تفریح کے لیے بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے ہیں، تھک بھی جاتے ہیں
سوتے بھی ہیں، اور کبھی کبھی مریضوں کی پورش سے گھبرا بھی جاتے ہیں، شاذ و
نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مزاج میں چڑچڑا پن آجاتا ہے، مگر یہ ڈاکٹر
شاکر اور ان کے شاگرد کس چیز کے بنے ہوئے ہیں کہ رات رات بھر جاگ
کر، دن دن بھر فاقہ کر کے ایک ایک گھر پر پہنچتے ہیں، دستک دیتے
ہیں، اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، مُردوں کو نہلاتے ہیں، کفن دیتے ہیں،
نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں، کندھا دیتے ہیں اور خود ہی قبرستان میں جا کر
دفن کر آتے ہیں، بیماروں کو دوائیں پلاتے ہیں، انجکشن دیتے ہیں، ان کی

نازبرداریاں کرتے ہیں، ان کی جھڑکیاں سہتے ہیں، کبھی کبھی جب وہ گالیاں دیتے ہیں تو انہیں بھی شوق کے کانوں سے سنتے ہیں، مگر کیا مجال کہ خفا ہو جائیں یا برا مان لیں، ایسا معلوم ہوتا ہے یہ لوگ انسان نہیں فرشتہ ہیں

یہ فرشتے ہیں جو انسان کی صورت میں زمین پر صرف اس لئے اترے ہیں کہ دکھی انسانیت کو فلاح و نجاح کا راستہ دکھائیں!

---

(۲)

قاسم گنج کے امدادی کیمپ کا انچارج صفدر ہے، اس کیمپ میں ایک ڈاکٹر دو نرسیں، اور کچھ قومی کالج کے رضاکار ہیں، صفدر اپنی پارٹی کے ساتھ قریب کے ایک گاؤں رحیم پور میں گیا ہوا ہے دن بھر قاسم گنج کے نئے پرانے مریضوں کی دیکھ بھال اور خدمت کے بعد مغرب کے قریب تھکی ہاری صبیحہ واپس آئی آج اسے کئی میل تک پیدل بھی چلنا پڑا تھا، گلا خشک، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی پاؤں گرد و غبار سے اٹے ہوئے چہرہ اداس اور پریشان آتے ہی اس کی آنکھوں نے صفدر کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملا، اس نے ایک ساتھی رضاکار سے پوچھا،

"صفدر صاحب ابھی تک نہیں آئے؟"

اس نے جواب دیا۔

"آتے ہوں گے ——— رحیم پور گئے ہیں، سنا ہے وہاں بہت

بُری طرح وبا پھوٹ پڑی ہے، ایک ایک گھر سے ایک ہی وقت میں کئی کئی لاشیں نکل رہی ہیں!" یہ سن کر صبیحہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے پوچھا،

"رحیم پور یہاں سے کتنی دور ہے؟"

رضاکار نے جواب دیا،

"ہو گا کوئی سات میل!"

صبیحہ نے فرمائش کی

"جلدی سے ایک کپ چائے مجھے پلا دو، میں رحیم پور جاؤں گی!"

رضاکار نے حیرت سے کہا،

"رحیم پور اس وقت جائیں گی آپ؟"

صبیحہ نے جھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا،

"تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گی، تنہا جاؤں گی، ہو سکے تو چائے پلا دو!"

رضاکار جلدی سے چائے بنا لایا۔ صبیحہ نے کھڑے کھڑے چند گھونٹ اُتارے، پھر ٹارچ ہاتھ میں لی، اور رحیم پور کے قصبہ سے باہر نکلی، رضاکار نے پھر اپنے خدمات پیش کئے،

"میں ساتھ چلتا ہوں!"

صبیحہ نے کچھ تامل کے ساتھ اس کی طرف دیکھا، پھر بولی،

"چلو —————"

کوئی ایک میل جانے کے بعد صفدر آتا ہوا مل گیا، وہ صبیحہ کو دیکھتے

چیخ پڑا۔

"تم اس وقت؟ ———— کہاں جارہی تھیں؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"آپ کے نقشِ قدم کی تلاش میں نکلی تھی! سنا ہے آج کل بہت محنت کر رہے ہیں آپ؟"

صفدر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا،

"ہاں صبیحہ بہت محنت کر رہا ہوں، لیکن یہ بہت محنت بھی بہت کم ہے، میں اس سے پہلے کئی مرتبہ رحیم پور آچکا ہوں، بڑی سرسبز و شاداب اور آباد و بارونق جگہ تھی، مگر اب تو وہ قبرستان ہے، ملک الموت نے کہیں بھی اتنی سرعت سے اپنے فرائض انجام نہیں دیئے ہوں گے، جس طرح رحیم پور میں دے رہا ہے۔ رحیم پور اب ایک آباد و بارونق موضع نہیں قبرستان ہے!"

صبیحہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی،

"یہی حال قاسم گنج کا ہے، نہ جانے خدا کو کیا منظور ہے ———"

لیکن میں کہتی ہوں آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں، اگر خدانخواستہ آپ بیمار پڑ گئے تو؟"

صفدر نے صبیحہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا،

"اطمینان رکھو، میں بیمار نہیں پڑوں گا، بڑا سخت جان ہوں، میری کمزوری تم ہو، تمہاری وجہ سے میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، لیکن یہ ایسا کام ہے کہ کرنے میں بھی مجھے تامل نہیں!

صبیحہ کانپ اٹھی،

"خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے ——— آپ واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟"

صفدر نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا،

"ڈر گئیں؟ ——— آخر ضرورت ہو نا، واپس کیوں چلا جاؤں؟"

"کیا ضرورت ہے آپ کی؟ میں تو کام کر رہی ہوں، کیا ضرورت ہے کہ ہم دونوں اپنی زندگی خطرہ میں ڈالیں!"

صفدر نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا،

"میں بھی تو یہی کہہ سکتا ہوں، کیا مان لو گی؟"

صبیحہ نے جواب دیا۔

"نہیں ——— اس لئے کہ آپ صرف میری وجہ سے آئے ہیں!"

صفدر نے اقرار کرتے ہوئے کہا،

"سچ کہتی ہو صبیحہ، واقعی میں تمہاری ہی وجہ سے آیا تھا، لیکن اب میری نیت بدل گئی ہے، اب میں تمہاری وجہ سے یہاں مقیم نہیں ہوں بلکہ ان بدبختوں اور گھیاروں کی وجہ سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ کاش میں ان کے کام آسکتا!"

صبیحہ نے خفا ہوتے ہوئے کہا،

"اور کس طرح کام آیا جاتا ہے، ذرا آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھئے،

کتنے نڈھال نظر آ رہے ہیں !"

صفدر ہنسنے لگا ،

"لیکن تم سے کم ذرا اپنی طرف تو دیکھو تم نے تو معلوم ہوتا ہے آئینہ دیکھنا بالکل چھوڑ دیا ہے ۔ !"

---

(۴۳)

قاسم گنج کے ایک گھر میں کئی لاشیں پڑی تھیں، مگر ان کا کوئی اٹھانے والا نہ تھا، کئی بیمار ایڑیاں رگڑ رہے تھے مگر کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا، صبیحہ نے جب اس گھر میں قدم رکھا، تو ایک بوڑھے نے جو چارپائی پر پڑا تھا اس سے پانی مانگا، صبیحہ نے جلدی سے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا، پانی پی چکنے کے بعد وہ زور زور سے سانس لینے لگا، اس نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، جسے بے رحم موت نے مجھ سے چھین لیا اور میں کچھ نہ کر سکا"۔

پھر اس نے دوسری چارپائی کی طرف اشارہ کیا،

"یہ میری شریف، سعادت مند اور خوش اطوار بہو کی لاش ہے، شوہر کے مرتے ہی اس کا دم بھی نکل گیا،

پھر اس نے ایک تیسری چارپائی کی طرف اشارہ کیا،

"یہ میری بیوی ہے، میری رفیقۂ حیات، پچاس سال تک گرم و سرد ہر زمانہ میں انتہائی وفاداری کے ساتھ اس نے میرا ساتھ دیا، لیکن بیٹے اور بہو کی محبت میں مجھ سے بے وفائی پر آمادہ ہو گئی، یہ بھی ان کے ساتھ مر گئی۔"

پھر اس نے ایک چھوٹی سی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا پوتا ہے، ۱۰ سال کی اس کی عمر ہے گلٹی اس کے بھی نکل چکی ہے صبح تک شاید یہ بھی اپنے ماں باپ اور دادی کے پاس چلا جائے گا، دیکھو تو کیسا بھسا ہوا بخار ہے، بیچارے کو، بیہوش پڑا ہے۔

یہ گلٹی تو میرے بھی نکل چکی ہے، لیکن مجھے یقین ہے، میں نہیں مروں گا اس لئے نہیں کہ زندگی کی خواہش رکھتا ہوں، اس لئے کہ زندگی سے نفرت کرتا ہوں، بیٹی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس بچہ سے پہلے میں مر جاؤں، تم نے نہ جانے کتنی زندگیاں بچائی ہوں گی، اور اس طرح بہت سا ثواب لوٹ لیا ہوگا لیکن بیٹی اگر مجھے ہلاک کر سکو، مجھے اگر زندگی کے جنجال سے نجات دے سکو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ لوگوں کی زندگی بچا کر تم نے اتنا ثواب نہیں کمایا ہوگا جتنا مجھے زندگی سے محروم کر کے کما لو گی!"

صبیحہ نے اس بوڑھے آدمی کو تسلی دی، رضا کاروں کی مدد سے ساری لاشیں اٹھوائیں، اور ان کے کفن دفن کا انتظام کیا، اب اتنے دنوں کام کرتے کرتے وہ خود بھی آدھی ڈاکٹر ہو گئی تھی، لڑکے اور بوڑھے دونوں کی حالت نازک تھی، دونوں بیہوش پڑے تھے اسنے جلدی جلدی انجکشن دیا، بوڑھے نے تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں لیکن پہچان نہ سکا، ہذیان بکنے لگا،

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بیہوش ہو گیا، منظر اتنا ہولناک اور دلگداز تھا کہ ساتھیوں میں سے کوئی بھی یہاں رہنے اور ان دونوں کی تیمارداری پر رضامند نہ ہوا، صبیحہ تن تنہا اس ویران گھر میں جو قبرستان بنا ہوا تھا رہی، اور رات بھر جاگ کر ان بیماروں کی سیوا کرتی رہی،

صبح ہوئی تو لڑکے نے آنکھیں کھولیں اور "آپا آپا" کہہ کر صبیحہ کے دامن سے لپٹ گیا، شاید اس کی مرحوم ماں کسی حد تک صبیحہ سے مشابہ تھی صبیحہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اُسے پیار کیا اور پھر بستر پر لٹا دیا، وہ ذرا ذرا دیر کے بعد بستر سے اٹھتا اور آپا آپا کہہ کر اس سے لپٹ جاتا، ہر مرتبہ صبیحہ اسے پیار کرتی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور آرام سے لٹا دیتی، اس سے فارغ ہوتی تو بوڑھے کے پاس جاتی اور اس کی دوا دوش میں لگ جاتی، اس کا سارا وقت انہی دونوں کی دیکھ بھال میں صرف ہو رہا تھا، لڑکا اس سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ جب بھی غفلت سے ہوشیار ہوتا، آپا آپا کی رٹ لگا دیتا، اور ایک لمحہ کے لئے بھی اُسے اپنے پاس سے نہ ہٹنے دیتا،

دوپہر کو اسے اطلاع ملی کہ صفدر کو بخار آ گیا ہے، پھر تھوڑی دیر بعد اطلاع آئی، گلٹی بھی نکل آئی ہے، رات کو خبر ملی کہ وہ بیہوش پڑا ہے ہذیان کا عالم طاری ہے اور بار بار اس کے نام کی رٹ لگی ہوئی ہے -

یہ اطلاعیں صبیحہ کے خرمنِ دل پر بجلی بن کر گریں، اس نے چاہا کہ وہ اس بوڑھے اور اس لڑکے کو خدا کے حوالے کر کے صفدر کے پاس چلی جائے،

اس کی تیمارداری کرے، اس کی خدمت کرے، اسے موت کے پنجہ سے چھین لے، لیکن جب بھی اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا، یہ معصوم بن ماں، اور بے باپ کا بے سہارا بچہ ہمک ہمک کر اس سے لپٹ جاتا، اور رونے لگتا صرف ایک ہی بات تھی جو وہ بار بار کہتا تھا

"میری آپا مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، میں تمہارے ساتھ چلوں گا!"

ان الفاظ میں کتنا درد تھا کتنا سوز تھا، اس صورت پر کیسی بے کسی تھی - بے بسی تھی، اس آواز میں کس بلا کی کشش تھی کہ دل خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگتا تھا، اس بچہ کا اب دنیا میں کوئی نہ تھا، اس کا بوڑھا دادا بھی داغِ جدائی دے چکا تھا، سارے قاسم گنج میں یہ گھر اتنا منحوس اتنا ڈراؤنا اور اتنا مرگ آفریں سمجھا جاتا تھا کہ کوئی بھی یہاں قدم رکھنے کو آمادہ نہ تھا، صبیحہ کے ایک طرف دل تھا، دوسری طرف فرض، ایک جانب ذاتی تعلق تھا، دوسری طرف بے سہارا انسانیت، وہ بڑی دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہی، دل یہ فیصلہ کرتا کہ اب اس لڑکے کو بھی مرجانا چاہیئے، کون اسے پالے گا؛ کہاں یہ رہے گا؛ میری جگہ یہاں نہیں، صفدر کے پاس ہے، پھر دل ہی آواز دیتا نہیں، لوگ اس سے گھن نہیں کرتے اس سے ڈرتے نہیں، اس کی تیمارداری اور خدمت میں لگے ہوئے ہیں، مگر یہ یتیم و یسیر بچہ، جو مجھے اپنی آپا سمجھ رہا ہے، اپنی ماں خیال کر رہا ہے، اگر دامن جھٹک کر میں چلی گئی تو یہ مر جائے گا کیا میں اسے مرجانے دوں؟"

صفدر کی حالت نازک ہوتی رہی، ادھر دل ہی دل میں نہ جانے کے

مرتبہ اپنی زندگی اس پر قربان کر چکی تھی، نہ جانے کتنی بار وہ اپنے خدا سے التجا کر چکی تھی کہ اس کی جان لے لے، اور صفدر کو اچھا کر دے، بار بار اس کی آنکھوں سے آبشار سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکتے اور گرتے تھے دل تھا کہ پھٹا جا رہا تھا، دماغ تھا کہ معطل ہو رہا تھا، حواس تھے کہ جواب دے رہے تھے، لیکن ——— در پہ بیٹھے ہیں ترے لیے زنجیر

وہ اس گھر کو اس بچّے کو نہ چھوڑ سکی، جیسے کسی نے اسے بیڑیاں پہنا دی تھیں، جیسے وہ ایک چٹان تھی، جو کسی طرح اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکتی!"

صفدر مر گیا!

صبیحہ دمِ آخر بھی اس کی بالیں پر نہ پہنچ سکی!

صفدر کی موت پر ڈاکٹر شاکر کی پارٹی میں جتنے ڈاکٹر شریک تھے جتنی نرسیں شامل تھیں، سب نے اس شریف ہونہار اور صالح نوجوان کی جان بچانے کے لئے اپنی زندگی خطرہ میں ڈال دی، لیکن خدا کی مرضی پوری ہوئی، وہ اس جہاں سے رخصت ہو گیا، اس کے ساتھ اس کی آرزوئیں اور حسرتیں بھی مٹ گئیں؛ اس کی موت پر، یہ ڈاکٹر بھی روئے، جو موت کی کارفرمائیاں دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں، یہ نرسیں بھی روئیں، جن کے لئے موت کوئی غیر معمولی چیز نہیں،

لیکن صبیحہ کے آنسو خشک تھے، وہ بالکل خاموش تھی، صفدر کا حادثہ وفات

سن کر بھی اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی، اس مظلوم لڑکے کی خدمت کرتی رہی، جس کا اس دنیا میں اس کے سوا کوئی نہ تھا،

بے شک صبیحہ کے نوحہ و ماتم سے در و دیوار نہیں گونجے، بے شک اس کی چشم خوں فشاں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا، لیکن اس غم نے صرف تین دن کی مدت میں سے کھا لیا، تین دن کی اس مختصر سی مدت میں اس کا روپ ختم ہو گیا، اس کی رعنائی کی زیبائی جواب دے گئی، وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی،

چوتھے روز وہ اس بچہ کی انگلی پکڑ کر قبرستان گئی، صفدر کی قبر پر اس نے ایک ہار چڑھایا، اور پھر وہیں قبر کے پاس بیٹھ گئی،

پھر اس نے سر جھکا لیا، اور اپنا گال قبر پر رکھ کر اکڑوں بیٹھے ہوئے اس طرح جھک گئی جیسے وہ کسی سے گلے مل رہی ہے،

تھوڑی دیر تک وہ لڑکا یہ منظر دیکھتا رہا!

جب بہت دیر گذر گئی، تو اس نے پھر آپا آپا کی رٹ لگا دی،

صبیحہ جو اس کی آواز سن کر سب کچھ بھول جاتی تھی اسے گلے لگاتی پیار کرتی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی تھی، اس وقت بالکل خاموش تھی، وہ تنگ آ کر رونے لگا، لیکن صبیحہ نے اسے گلے نہیں لگایا، پیار نہیں کیا، اس کے آنسو نہیں پونچھے! ——— وہ اب اس دنیا میں تھی کہاں ؟